

# السير وون

اور جغرافیہ عالم



مولانا ابوالکلام آزاد



# ایبیرنی اور مغزافونہ علم

از

ابوالکلام آزاد



ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان

۱۸۰۸۶ - الحیدری، کراچی ۳۳

۲  
جملہ حقوق محفوظ

136086

تصنیف	البیرونی اور جغرافیہ عالم
مصنف	مولانا ابوالکلام آزاد
اشاعت اول	جولائی ۱۹۸۰ء
ناشر	ڈاکٹر حسین ہانسی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ - نئی دہلی ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء
اشاعت ثانی	ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۰۸۶ - انجیدری، کراچی ۳۳
تعداد	ایک ہزار
قیمت	۱۸ روپے
طابع	المخزن پرنٹرز (مکتبہ رشیدیہ) پاک چوک، کراچی

ہلنے کے پتے

عصری مطبوعات

اے/۳۲۲ - بلاک ڈی - ناظم آباد - کراچی ۳۳

مکتبہ شاہد

علی گڑھ کالونی کراچی ۳۳

# فہرست

۵	ابوریحان اور ابوالکلام
۶	پیش لفظ
۹	ابوالکلام آزاد
۲۵	ابوریحان البیرونی
۲۹	کچھ معطلوں کے بارے میں
۳۵	البیرونی اور جغرافیہ عالم
	القانون المسعودی
	پروفیسر توگان کی کامیابی
	عربی میں ہیئت کی پہلی کتاب
	الہیۃ الکرومی اور الہیۃ التجربی
	ہندی حساب کی بنیادی غلطیاں
۷۱	البیرونی کا عہد اور عربی فن جغرافیہ و تخطیط
	البیرونی کا علمی کارنامہ
۷۶	ہفت اقلیم
۸۴	اقلیموں کی مساحت اور کرہ کی مجموعی مساحت
۸۸	قبتہ الارض اور بعض قدیم مقامات
	قبتہ الارض
	بعض قدیم مقامات
	البیرونی کے اطوال اور موجودہ اطوال کا فرق

- ۹۷ اہل عہد کی جغرافیائی تحقیقات کی بعض خصوصیتیں  
 ۱۰۲ محمود غزنوی اور البیرونی  
 ۱۱۲ ہندوستان میں البیرونی کی حدود سیاحت  
 ۱۱۳ البیرونی کی دہانہ سیرت  
 ۱۱۹ الصیغہ اور الجماہر  
 ۱۲۰ ہندوستان اور حکیم ابوریحان بیرونی  
 کتاب الہند

ہندوستان کے سمجھنے میں دشواریاں

۱۔ زبان

۲۔ ذہنی اختلاف

۳۔ رسوم و عادات

۴۔ مسلمانوں کا حملہ

۵۔ تنگ نظری

کتاب الہند

۱۲۳

ہندوستان کے فنون لطیفہ اور عرب

راگ کے ذریعے شکار کا طریقہ

۱۲۶

اصطلاحات

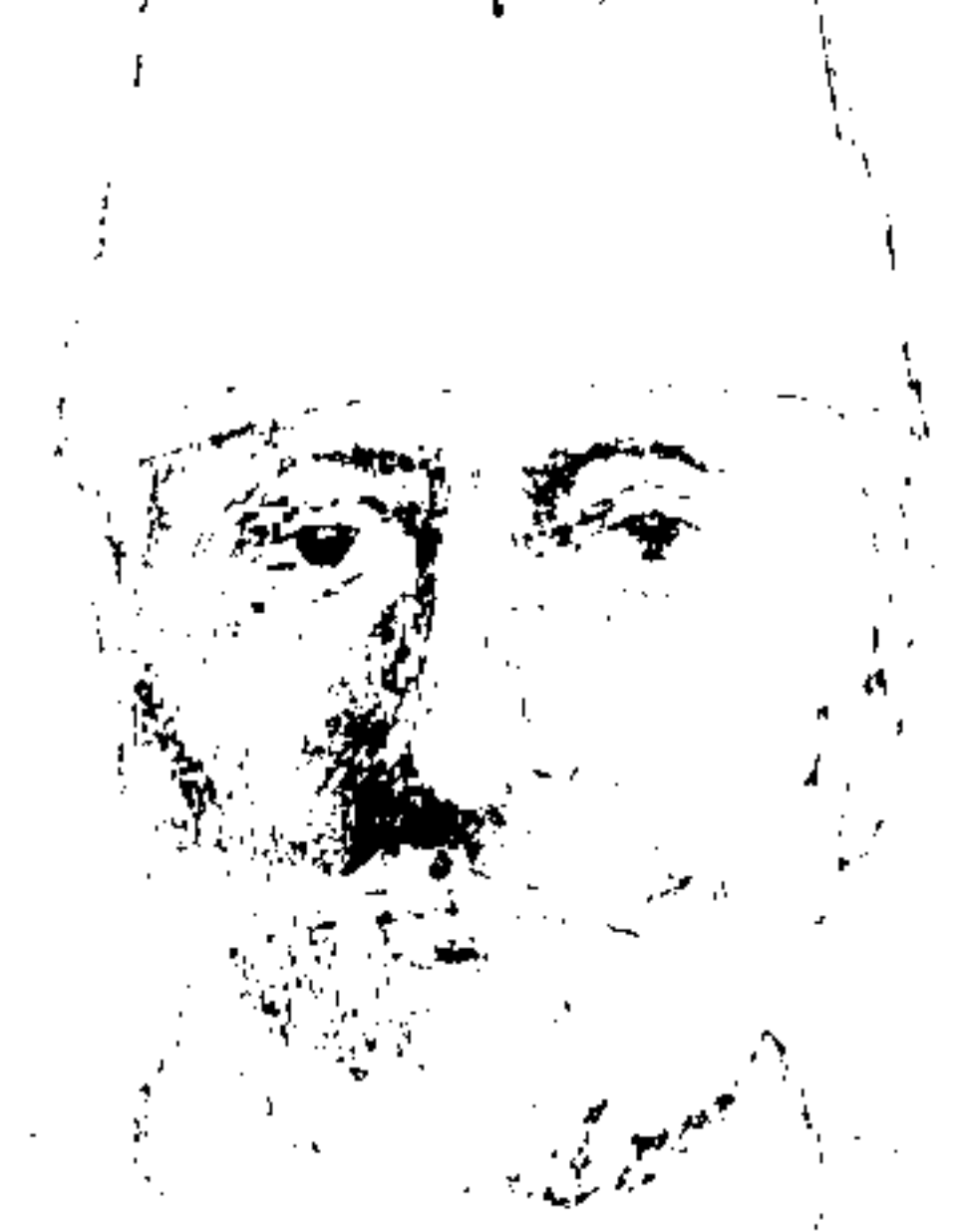


عفی الدین احمد نام ابو الکلام کنیت اور آزاد شخص تھا۔  
 والد کا نام خیر الدین ابن محمد لادھی اور وطن آبائی رہی تھا۔  
 ذوالحجہ ۱۲۵۵ھ مطابق اگست ۱۸۸۸ء کو معلوم میں پیدا ہوئے۔  
 تعلیم کا آغاز مکہ معظمہ میں ہو گیا تھا کہ ولید خان بہادر دستان پورے  
 تعلیم کے بغیر داخل کلاں میں گئے ہوئے تھے اس کی خبریں وہ  
 دینی تقویٰ تحصیل سے فارغ ہو چکے تھے۔

۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۰ء تک میرٹھ میں معلم المصائب اور صاحب الامور  
 خدنگ نظر لسان الصدوق اللہ وکیر وکیر وکیر وکیر اور  
 میں معلوم کیا گیا کہ میرٹھ میں ۱۹۱۲ء میں لکھوئے  
 اہلکار لکھوئے سے جاری کیا جو صحافت اور تبلیغ کی ایک  
 بے مثال حیرت تھی۔

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۵ء تک چھ بار آزادی وطن کی تحریکوں کی  
 منزل سے گزرا اور قیدی کی مجموعی مدت طویل قید میں رہنے کے  
 میں وہ آزاد ہندوستان کے لیے زبردست تعلیم مقرر ہوئے اور اپنی وفات  
 تک اس منصب پر فائز رہے۔

عربی مولانا کی ماہی بان تھی اور اردو کے مصنف اور  
 انگریزی سائنس و ادب کے ذہنی استفسار کے لیے مشہور تھے اور  
 ہیئت و علم میں گہری نظر رکھتے تھے اور ہر زبان کے لغت  
 خاصہ لیاؤس فریڈ ایئرلی اور ہرنانیہ عالم کی مشہور تصانیف ہیں۔  
 مولانا نے ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں انتقال فرمایا اور  
 مسجد کے سامنے ان کا سر اترتا ہے۔



ایئرلی کا پورا نام برہان عفی ابویحیٰ محمد بن احمد تھا۔  
 ایئرلی کے عرف سے عالیہ شہرت حاصل کیا اور ۱۹۲۵ء سے  
 مطابق ۱۹۲۳ء کو خوارزم کے ماتحت کات میں پیدا ہوئے۔  
 تعلیم و تربیت کے مراحل خوارزم میں طے ہوئے ۲۳ برس کی عمر میں  
 وطن سے نکلے تھے غرض کہ وہیں رہے پھر ہرجان اور طبرستان کے  
 حکم شمس السعالی قابوس کی مائتہ اختیار کی اس کے بعد مختلف  
 مدتوں تک خوارزم خوارزم کے حکم علی بن مامون ابو العباس  
 مامون اور غزنوی سلاطین میں محمود مسعود اور مودود کے  
 درباروں سے وابستہ رہے تقریباً ۱۳۳ھ میں وہ مودوغزنوی  
 کے ساتھ ہندوستان آئے اور ۱۳۴ھ تک وہ پنجاب کشمیر اور  
 سندھ کے مختلف مقامات پر عہدہ منداہ اور سنسکرت زبان  
 کی تحصیل اور ہندوستانی علوم و فنون کے مطالعے میں مصروف رہے۔  
 دہلی کی فارسی عربی سائنس کی ترقی اور ترقی اور جانی عبرانی  
 یونانی زبان اور سنسکرت کے واقف اور ذہنی فلسفہ تاریخ و جغرافیہ  
 ہیئت نجوم ریاضی اور ان علوم کی مختلف شاخوں میں نظر و عبور رکھتے تھے۔  
 ان کے پیچھے مختلف علوم و فنون میں تقریباً ۱۰۰۰ سے زائد  
 چھوٹی زبان میں سے کتاب لکھی گئی ہیں اور ان کی تصانیف  
 نہایت لوگوں کی مہربانی سے مولانا ابو العباس نے خاص طور پر  
 ایرانی سندھ کے لوگوں میں ۱۳۴۵ء سے ۱۳۵۰ء تک  
 ۱۳۵۰ء سے ۱۳۵۵ء تک عربی میں انتقال کیا۔

## پیش لفظ

اردو زبان اور اس کی ترقی و اصلاح مولانا ابوالکلام آزاد کا زندگی بھر موضوع رہا۔ انکی علمی زندگی کا باقاعدہ آغاز لسان الصدق سے ہوتا ہے جو انجمن ترقی اردو کا پہلا باقاعدہ ترجمان تھا اور جس کے اجرا کے چار مہینے میں سے تین اردو زبان کی ترقی، علمی مذاق کی اشاعت اور اردو تصانیف پر منصفانہ رپورٹ تھی۔ یہ واقعہ نومبر ۱۹۰۲ء کا ہے لیکن اگر مولانا کی ابتدائی کڑیوں کی تلاش حصہ دہو تو لسان الصدق کے اجرا کے واقعے سے کم از کم ایک سال پیچھے پٹنا پڑے گا۔ اس وقت مولانا ہمیں ایک تذکرہ الشعرا کی تالیف میں مصروف نظر آتے ہیں جس کا ابتدائی حصہ انہوں نے مکمل بھی کر لیا تھا۔ اس وقت وہ ہمیں فارسی لغت کی تحقیق اور ایک فرہنگ جدید کی تدوین میں مشغول نظر آتے ہیں۔ اگرچہ آج دنیا کے علم میں تذکرہ الشعرا کے ایک مضمون حکیم خاقانی شروانی (مخزن لاہور اگست ۱۹۰۲ء) کے سوا ان دونوں چیزوں کا کوئی وجود نہیں لیکن خدمتِ زبان کے باب میں ہم ان کے فوق اشتغال سے بے خبر نہیں ہیں۔ پینچو پینشن کے عنوان سے مولانا کا ایک مضمون اردو کے رموز و اوقاف اور علامات قرأت و تحریر پر خدنگ نظر لکھنؤ (اکتوبر و نومبر ۱۹۰۲ء) کی دو اشاعتوں میں چھپا تھا اس لیے اگر پس منظر کو چھوڑ کر بھی تاریخ کا ٹھیک ٹھیک تعین کیا جائے تو مولانا کے ذوق و خدمتِ ادب و لسانیات کی تاریخ کا آغاز ۱۹۰۲ء کے وسط سے جب کہ ان کی عمر صرف چودہ سال کی تھی ثابت ہو جاتا ہے پھر مولانا کا یہ ذوق و اشتغال زندگی بھر رہا۔

۱۹۱۲ء میں اہلال کا اجرا محض تاریخ صحافت کا ایک یادگار واقعہ نہ تھا اس سے ادب و لسانیات کی تحریک فروغ و قبول عام کا ایک دور بھی شروع ہوتا ہے۔ مولانا نے اہلال میں مقاصد اور جن افکار و تعلیمات کی اشاعت کے لیے نکالا تھا تو صرف ان کا میڈیم اور ذریعہ ابلاغ ہی اردو زبان نہ تھی بلکہ وہ علمی اکتشافات و تحقیقات اور تراجم و اصطلاحات کی ایک دعوت عام اور لسانیات کے موضوعات اور طباحت کے مسائل پر افکار و معلومات کی اشاعت، تبادل خیالات کا بہت بڑا ذریعہ بھی تھا۔ ان موضوعات پر اہلال کے صفحات میں نہایت بیش قیمت مقالات و معلومات موجود ہیں۔

۱۹۲۵ء میں جب اہلال دوبارہ جاری ہوا تب بھی اس کے مقاصد کا دائرہ اتنا ہی وسیع تھا جتنا کہ دور اول میں تھا اور اس کے صفحات میں اردو زبان کی ترقی اور طباحت کے مسائل پر افکار و معلومات کا اتنا ہی قابل قدر ذخیرہ بھی موجود ہے۔ اس کے بعد بھی اردو ٹائپ مائٹ رائٹر کے مسائل سے وہ ہمیشہ دلچسپی لینے رہے اور ان کے اختیار و رواج کو وہ اردو زبان کی ترقی کے لیے بنیادی اور سب سے



اہم ضرورت سمجھتے تھے۔

زندگی کے آخر دور میں وہ تذکرہ میں طرز کتاب اور املا کی اصلاح میں مصروف نظر آتے ہیں ان کے ان اشغال سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے پچیس سال سے زیادہ گیسوئے اردو کو سنوارنے میں صرف کیے تھے۔

اردو املا کے بارے میں مولانا کے بعض خاص اختیارات تھے۔ الہلال میں انہوں نے ان کا اہتمام کیا تھا لیکن قومی زندگی کے روزمرہ مشاغل اور وقت کے تقاضوں نے انہیں ان کے ترک پر آمادہ کر دیا تھا اور دورِ آخر میں وہ سہل نگاری کی طرف مایل ہو گئے تھے اور بہت آسان زبان استعمال کرنے لگے الہلال، اور دورِ خلافت کے برعکس ان کی تقاریر کی زبان بھی بہت سادہ اور عام فہم ہو گئی تھی۔ تخریر کو سادہ اور عام فہم بنانے کے لیے انہوں نے املا میں بعض اصلاحات اختیار کر لی تھیں۔ مالک رام کی نظر سے تذکرہ کا وہ نسخہ گزرا ہے جو دورِ آخر میں مولانا کے زیر نظر تھا۔ اس میں مولانا نے طرز کتابت اور املا میں اصلاحات فرمائی ہیں۔

تذکرہ اور غبارِ خاطر کے آخری ایڈیشن ان اصلاحات کی روشنی میں مرتب کیے گئے ہیں۔ چنانچہ مولانا کے سابقہ طرز کتابت کے برعکس امۃ، سنۃ وغیرہ الفاظ کو امت، سنت بنا دیا گیا ہے۔ ترکیب اضافی و توہمینی میں ہمزہ کی جگہ بنائے بنا کر علمائے کرام صلاتے عام وغیرہ کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح آزمائش و غیرہ الفاظ میں ہمزہ کو ’ئی‘ سے بدل دیا گیا ہے۔ مولانا ’لٹیر‘ لکھنے کے عادی تھے۔ لیکن اب مولانا کی اصلاحات کے مطابق اسے بھی ’تیار‘

کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح وہ الفاظ جن کے آخر میں ’ئے‘ آتی ہے۔ ان پر ہمزہ کے استعمال کا مسئلہ تھا۔ اب یہ قاعدہ بن گیا ہے کہ ’ئے‘ سے پہلے حرف مکسور ہو تو ہمزہ نہیں لکھا جاتا مثلاً ’یے‘ دے، کیے وغیرہ اس کے

سوا دوسرے لفظوں میں ہمزہ استعمال کریں گے مثلاً ’گے‘، ’پے‘، ’ہوئے‘ وغیرہ۔ پہلی قسم میں ہمزہ کا استعمال اور دوسری قسم میں نقطوں کا استعمال درست نہیں سمجھا جاتا۔ ہائے مخلوط کے استعمال میں احتیاط اور ہر

مستقل لفظ کو الگ لکھنے کا اہتمام مولانا کو شروع سے تھا۔ ۱۹۲۷ء میں ’الہلال‘ دوبارہ جاری کیا تو اس کا انتظام

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے سپرد تھا۔ ان کی نظر مولانا کے املا اور رسم الخط کے خصائص پر نہ تھی۔ مولانا

نے انہیں جن امور کی طرف توجہ دلائی ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ بلا ضرورت انگریزی اسماء و مصطلحات استعمال نہ کی جائیں۔ مثلاً پورٹ، اسٹیٹ منٹ، کانفرنس، پارلیمنٹ، ایڈیٹر۔ ان کے لیے روداد، بیان، موتمر، مجلس یا مجلس حکومت، مدیر وغیرہ الفاظ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

۲۔ حتی الامکان ہر لفظ کو الگ اور مستقلاً لکھنا چاہیے۔ مثلاً ’سمجھ کر‘، ’پہنچ کر‘، اس کو۔

۳۔ ہائے مخلوط اور غیر مخلوط کا فرق ملحوظ رکھا جائے۔ مثلاً ’کھانا‘ انہیں وغیرہ میں ہائے مخلوط ہے مگر کہیں نہیں

دشیرد میں غیر مخلوط ہے۔

اس کے علاوہ مولانا کے طرز کتابت میں ایک تبدیلی یہ آگئی تھی کہ وہ آخر حرف بار اور الف کو محل استعمال کے مطابق "یا" سے بدل دیتے تھے مثلاً فلسفہ کی کتاب "تجربہ کی بات" مشاہدہ کی ضرورت مطالعہ کا شوق وغیرہ جملوں میں وہ فلسفے، تجربے، مشاہدے اور مطالعے کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ اگرچہ اس کا پورا اہتمام تذکرہ اور غبار خاطر کی آخری اشاعتوں میں بھی نظر نہیں آتا۔

مولانا آزاد کے ان اختیارات و اصلاحات کی موجودگی میں یہ توقع بجا نہیں ہو سکتی کہ اب مولانا کی جو کتاب بھی مرتب کی جائے گی اس میں ان امور کا خیال رکھا جائے گا۔ لیکن جب ہم البیرونی اور جغرافیہ عالم کے منظر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے کہ اس میں ان امور کا بالکل خیال نہیں رکھا گیا اس میں طرز کتابت کی یکسانیت تک تعلم منقود ہے۔ چنانچہ اس میں تیار پرانا، گاؤں، نویں وغیرہ کا املا ان شکلوں کے علاوہ طیار، پورانا، گاؤں، نوے اور نوویں بھی ملتا ہے۔ ہائے مخلوط وغیر مخلوط کے فرق، اضافت میں ہزوف کے بجائے شے، اور لفظوں میں ہمزہ یا شے کے استعمال میں کوئی احتیاط نہیں برتی گئی۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ مولانا کی اصلاحات کے مطابق اس مقالے کو تیار کر دیا جاتا تاکہ پوری کتاب املا اور طرز کتابت کے ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی۔ اسی طرح انگریزی الفاظ و اسماء میں اگر کوئی غلطی مولانا کے سہو قلم سے یا نقل نویس کی عدم توجہ سے سووے میں راہ پاگئی تھی تو اسے متن ہی میں درست کر دیا جاتا۔

ہم اس اعتراض کے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس کتاب کی اشاعت جامعہ ملیہ کی بہت بڑی خدمت ہے لیکن اس میں اصلاح کے عمل سے مایوسی ہوتی ہے۔ زیر نظر اشاعت میں ان نقائص کو دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس اشاعت کی یہ خصوصیت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اس میں ڈاکٹر ابو سلیمان شاہ جہان پوری کے قلم سے مولانا آزاد پر ایک ایسا مقالہ شامل ہے جس میں البیرونی کے مطالعے سے مولانا آزاد کے ذوق کی نصف صدی سے زیادہ طویل تاریخ مرتب ہو گئی ہے اس مقالے میں مولانا نے مختلف علوم و فنون کی جو اردو یا انگریزی مصطلحات استعمال کی ہیں ان کی فہرستیں مرتب کر دی ہیں "ہندوستان اور حکیم ابوریحان بیرونی" کے عنوان سے مولانا کا ایک مضمون "الہلال" کے صفحات سے لے کر اور کتاب الہند کے بارے میں ایک طویل اقتباس "غبار خاطر" سے اخذ کر کے بھی اس کتاب کی زینت بنا دیا گیا ہے۔ ان اصلاحوں اور اضافوں سے "البیرونی اور جغرافیہ عالم" کی اس اشاعت کی اہمیت یقیناً بہت بڑھ گئی ہے۔

## ابوالکلام آزاد

مولانا کے سوانح علمی کا ایک ورق اپنی وفات سے پانچ برس پہلے کیم فروری ۱۹۵۲ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے نیشنل لائبریری گلگتہ کا افتتاح کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی تھی وہ محض رسمی افتتاحی تقریر ہی نہ تھی بلکہ اس میں مولانا نے اپنے علمی سوانح کا ایک ورق بھی اہل علم کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ مولانا نے فرمایا تھا:

”جب نیشنل لائبریری کی کونسل نے مجھے دعوت دی کہ میں لائبریری کی نئی عمارت میں اس

کا افتتاح کروں تو میرے حافظہ میں قدرتی طور پر اب سے ۲۸ سال پہلے کے ایک واقعہ کی یاد تازہ ہو گئی جب میں پہلی بار اس لائبریری میں داخل ہوا تھا۔ یہ ۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے، اس وقت میں صرف ۱۶ سال کا ایک لڑکا تھا۔ میری تعلیم ختم ہو چکی تھی اور قدیم تعلیمی نظام کی روایت کے مطابق مشق اور استعداد ہم پہنچانے کے لیے مختلف مضمونوں کے طلبہ کی ایک جماعت کو میں نے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ لائبریری کے بھارتی کلکشن میں البیرونی کا مشہور تصنیف ”القانون“ کا ایک نادر مخطوطہ ہے۔ یہ سن کر میں اپنے ایک دوست مرزا فضل الدین احمد کے ساتھ جنہوں نے بعد میں میری کتاب ”تذکرہ شائع کی تھی، یہاں آیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا اس وقت یہ لائبریری ”امپیریل لائبریری“ کے نام سے مشہور تھی اور شکاف ہال میں قائم تھی۔ لائبریری سے استفادے کے لیے پہلے ایک اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ مرزا فضل الدین اپنے لیے یہ اجازت نامہ حاصل کر چکے تھے لیکن جب انہوں نے میرے لیے اجازت نامہ حاصل کرنا چاہا تو لائبریری اسٹنٹ نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور میری عمر دریافت کی۔ میں نے کہا میری عمر تقریباً ۱۶ سال ہے۔ یہ سن کر اس نے مجھے اجازت نامہ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ۸ سال سے کم عمر کے کسی لڑکے کو اجازت نامہ نہیں مل سکتا۔

مرزا فضل الدین نے ہر چند اسے مطمئن کرنا چاہا اور کہا کہ اگرچہ ان کی عمر یہی ہے لیکن یہ منطق، فلسفہ اور فقہ کے ایک استاد ہیں۔ اس لیے انہیں لائبریری سے استفادے کی اجازت ملنی چاہیے۔ اور اگر ۸ سال سے کم عمر کے کسی نوجوان کے لیے لائبریری سے استفادے کی اجازت نہیں ہے تو انہیں اس قاعدے سے مستثنیٰ قرار دیا جانا چاہیے میں نے لائبریری اسٹنٹ کو دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ اس بیان کی صحت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ مرزا فضل الدین نے

لائبریری سے ملنا چاہا لیکن بد قسمتی سے وہ اس وقت موجود نہیں تھے۔ لائبریری میں داخلے کی یہ میری پہلی کوشش تھی جسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور میں مایوس ہو کر لوٹ گیا تھا۔

چند سال کے بعد جب میرے ایک فاضل دوست ہری ناتھ دے لائبریری ہونے تو میرے لیے اس لائبریری سے استفادے کی رکاوٹ دور ہو گئی اور میں نے اس کے علمی ذخیرے سے بہت استفادہ کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ قاعدہ بعد میں رہا یا نہیں۔ لیکن میرے لئے اس لائبریری کی نہ صرف نادر کتابوں بلکہ بہت قیمتی مخطوطوں کے حصول میں بھی کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ میں جب تک کسی چیز کو اپنے پاس رکھنا چاہتا، رکھتا اور جو چاہتا نقل کر لیتا۔ میں بہت خوش ہوں کہ مجھے اس لائبریری کے افتتاح کا اعزاز حاصل ہوا ہے اور اس کے دروازے جواب سے ۲۸ سال پہلے میرے لیے بند تھے علم و ادب کے تمام شائقین کے لیے کسور

دیے جا رہے ہیں۔

الہیرونی سے مولانا کی دلچسپی ————— مولانا کے اس بیان سے قومی کتب خانے کی تاریخ

پر بھی روشنی پڑتی ہے اور نہ صرف مولانا کے علمی سوانح کا ایک ورق ہمارے مطالعے میں آتا ہے بلکہ الہیرونی سے مولانا کی دلچسپی کی ابتدائی تاریخ کا سراغ بھی مل جاتا ہے۔ اب اس مقالے سے مولانا کے ابتدائی ذوق کی تاریخ پر مزید روشنی پڑتی ہے اور بعض نئی باتیں بھی علم میں آتی ہیں جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ الہیرونی سے مولانا کی دلچسپی برائے نام ہی نہ تھی بلکہ الہیرونی کی زندگی کے اہم واقعات، جغرافیے سے اس کے ذوق و انہماک، اس کی سیرت اور ذہن و فکر کے خصائص اور اس کے خاص میدان میں مقدمات اور متاخرین میں اس کے امتیازات پر ان کی گہری نظر تھی۔ مولانا نے اس مقالے میں ان مباحث پر روشنی ڈالی ہے۔

القانون کا نسخہ کلکتہ ————— مقالے کے شروع میں ایک طویل بحث القانون کے مختلف

نسخوں کے باب میں ہے۔ یہ وہ نسخے ہیں جو زکی ولیدی توغمان کے مطالعے میں آئے تھے ان میں سے جامع بایزید کے کتب خانہ ولی الدین آفندی کی صحت سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ اس لیے زکی ولیدی نے تصحیح و ترتیب کے لیے اسی کو بنیاد بنایا تھا۔ لیکن مولانا آزاد کی نظر سے کلکتہ کی ایسٹرن لائبریری کا نسخہ گذرا تھا، اس لیے سب سے زیادہ تفصیل اسی کے ضمن میں ملتی ہے۔ مولانا نے اس نسخے کی جہاں

نوودی کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے۔

مولانا کہتے ہیں:

» ہندوستان کے کتب خانوں میں بھی اس کے دو نسخے پائے گئے ہیں، ایک ایسیریل لائبریری کلکتہ میں ہے۔ دوسرا بمبئی کی ملا فیروز لائبریری میں ہے۔

ایسیریل لائبریری کے نسخے کی تاریخ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ نسخہ ۱۵۶۲ء میں ایک شخص ابو الفتح نصر بن محمد بن ہبہ اٹھانے کسی دوسرے نسخے سے نقل کیا تھا۔ ۱۸۱۸ء میں یہ نسخہ ایک شخص اوصد بن سعد بن بہرام البسقی کی ملکیت میں آیا۔ اوصد بن سعد کے بعد یہ نسخہ مختلف شخصوں کے قبضے میں آیا اور انہوں نے اپنی اپنی مہریں اس پر ثبت کیں۔ لیکن اب یہ مہریں پڑھی نہیں جاتیں کیونکہ کسی شخص نے انہیں کوشش کر کے مٹا دیے۔ پھر آخری صفحے میں دو مہریں صاف صاف نمایاں ہوتی ہیں۔ ان دونوں میں ایک ہی نام درج ہے » فاضل خاں بندہ شاہجاں « ان مہروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجاں کے عہد میں یہ نسخہ فاضل خاں لے آیا تھا۔ چونکہ اس فاضل خاں کے حالات سے ہم بے خبر نہیں ہیں اس لیے اس منزل پر پہنچ کر اس کے درود مند کا صحیح زمانہ متعین کر لیا جاسکتا ہے۔

فاضل خاں امرائے عہد میں ایک غیر معمولی دماغ کا شخص تھا اور یہ بات چونکہ مولانا آزاد کے خاص ذوق کی تھی۔ اس لیے مولانا نے اس کے فضائل کا تذکرہ تقریباً ایک صفحے میں بہت شوق سے کیا ہے۔ یہاں صرف چند باتیں درج کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

» فاضل خاں کا نام علامہ الملک توفی تھا۔ یہ شاہجاں کے جلدس کے ساتویں سال ایران سے ہندوستان آیا اور اپنے فضل و کمال کی وجہ سے بہت جلد شہرت حاصل کر لی، صاحب مائرا الامراء نے اس کے حالات میں لکھا ہے کہ فنون حکمت طبعی میں کیتائے روزگار تھا خصوصاً علم ہیئت و نجوم میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

» فاضل خاں اولاد تھا، لیکن اس کے بعض رشتہ دار فرخ سیر کے عہد تک مختلف عہدوں پر ملازم رہے۔ آخری منصب دارنہ اضیاء الدین تھا۔ جس نے فرخ سیر کے عزل کے بعد انتقال کیا بہت ممکن ہے کہ اسی عہد میں اس کا کتب خانہ منتشر ہوا ہو۔

فاضل خاں کے خاندان کے قبضے سے نکل کر یہ کتاب مولوی صدر الدین احمد کے قبضے میں آئی۔ مولوی صدر الدین بہار ضلع برودان (بنگال) کے رہنے والے تھے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں علوم درسیہ کی تکمیل کی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں جب لارڈ کرزن نے ایسیریل لائبریری قائم کی تو ان کے خاندان کے بعض اراکان نے اپنا خاندانی کتب خانہ گورنمنٹ کے

حوالہ کر دیا کہ لائبریری کی ایک شاخ کی صورت میں قائم رکھا جائے۔ چنانچہ اس طرح یہ نسخہ  
 ایسیریل لائبریری کے قبضے میں آگیا۔ انسانوں کی طرح کتابوں کی زندگیوں کی بھی سرگزشتیں ہوتی ہیں۔  
 اٹھ صدیوں کی جہاں نوردی کے بعد یہ کتاب اب کلکتہ کی ایک عمارت میں مقیم ہے۔  
 "القانون" کے نسخہ کلکتہ کی جہاں نوردی کی سرگزشت سنانے کے بعد اس کی صحت کے بارے میں مولانا  
 نے خالص محققانہ انداز میں یہ فیصلہ فرمایا ہے:

» یہ نسخہ عرصہ تک میرے مطالعہ میں رہا ہے۔ عربی عبارت کی عام اغلاط اس میں کم ہیں، لیکن  
 جہاں تک ہندوستانی ناموں کی تصحیف اور علمی مصطلحات و اعلام کے ضبط و تغیر کا تعلق ہے، یہ نسخہ  
 بھی یورپ کے نسخوں کی طرح ناقابل اعتماد ہے۔

آگے چل کر بھی کئی مقامات پر مولانا نے اس قسم کے اشارات کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ  
 نسخہ مولانا کے مطالعے میں رہا تھا اور اس کے خصائص پر مولانا کی نظر تھی۔ ایک مقام پر تو مولانا نے  
 اس کے زیر مطالعہ آنے کا سال بھی بتا دیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

» ڈاکٹر ڈورڈ سٹراؤ نے کتاب الہند کی ایک تفسیر سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ البیرونی کی حدود  
 سیاحت ہندوستان میں ملتان اور لاہور سے آگے نہیں بڑھی تھیں۔ چنانچہ اس وقت سے یہ بات  
 بطور ایک مسلمہ واقعہ کے تسلیم کر لی گئی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ البیرونی نے ہندوستان میں سے  
 صرف ملتان اور لاہور کو دیکھا تھا۔ لیکن ۱۹۰۶ء میں جب مجھے القانون المسعودی کے نسخہ ایسیریل  
 لائبریری کلکتہ کے مطالعہ کا موقع ملا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ رائے نظر ثانی کی محتاج ہے،  
 اب تو گان آفندی کے اس مجموعے کے مطالعے کے بعد میں دلوثی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ البیرونی  
 کی سیاحت ہند کا دائرہ صرف پنجاب ہی میں محدود نہ تھا۔

اس کے بعد القانون کے حوالے سے البیرونی کی سیاحت ہند کے دائرے کو لاہور و ملتان سے  
 سندھ کے ساحل سمندر کے ایک مقام تک وسیع کر دیا ہے۔ صفتہ المسمورہ میں البیرونی کی البیدرہ کا ایک  
 اقتباس دیکھ کر انہیں خاص طور پر خوشی ہوئی اس لیے کہ اس سے سندھ کے سفر کا مزید ثبوت مل جاتا ہے۔  
 البتہ یہ عقیدہ البیدرہ کا حوالہ بھی کھولنے میں ناکام رہا کہ سندھ میں ساحل سمندر پر وہ کون سا مقام  
 تھا جہاں ایک خاص رصدی عمل انجام دیا گیا تھا۔ البتہ اس کی سیاحت ہند کا زمانہ پوری طرح تاریخ  
 کی روشنی میں آجاتا ہے۔ یہ سیاحت اس نے ۳۱۰ھ ہجری کے بعد کی اور تقریباً نو دس برس تک  
 وہ پنجاب، کشمیر اور سندھ میں اپنے علمی مشاغل و تجارت میں مصروف رہا۔

مولانا کی ہمہ جہت شخصیت | مولانا آزاد کے اس تحقیقی مقالے کے مطالعے سے اندازہ کر لیا جاسکتا ہے کہ

صرف زکی ولیدی کی کتاب پڑھ لینے سے مولانا کو البیرونی کے مطالعے کا شوق پیدا نہیں ہو گیا تھا بلکہ ۱۹۰۴ء  
یا اس سے بھی پہلے سے مولانا کے مطالعہ و نظر کا یہ موضوع تھا۔ اور البیرونی پر اس وقت تک ہندوستان  
میں جو کام ہوا تھا اس پر مولانا کی نظر تھی۔

اس کتاب میں مولانا آزاد کی ہمہ جہت علمی شخصیت کے متعدد پہلو اور سائنٹی فک مطالعے کی بے شمار  
مثالیں ملتی ہیں۔ البیرونی کی مغز و شخصیت اس کی دماغی سیرت اور اس کی علمی تحقیقات اور کارناموں پر یہ  
دلفریب مقالے کوئی ایسا شخص ہی لکھ سکتا تھا جس کا مطالعہ مذہبیات اور عربی ادب سے بڑھ کر تاریخ،  
جغرافیہ، نجوم، ہیئت اور ریاضی کے علوم اور ان کی تاریخ تک وسیع ہو۔ یہ مقالہ ایک ایسے جامع دماغ  
کی مثال بھی پیش کرتا ہے جو مطالب کے اندر ترتیب ہی کی عمدہ قابلیت نہیں رکھتا بلکہ وہ مثال حافظے  
کا بانک بھی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے مؤلف کے ذہن اور اس کے انداز تک کو سمجھنے میں بھی  
مدد ملتی ہے اور پتا چلتا ہے کہ مختلف علمی و عملی مسائل میں مولانا کا دماغ کس طرح سائنٹی فک انداز میں  
کام کرتا تھا۔ مولانا کے اس سائنٹی فک مطالعے نے ان کے ذہن کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ ان کا ذہن  
حقائق و دقائق اور اصول و قواعد کا ایسا نوگر ہو گیا تھا کہ انسانی ذہن کے وہ افکار و ادہام اور دماغ  
کے دہن و تخمین جو لوگوں کو غلط روی اختیار کرنے اور اضطراب کے بستر پر تڑپانے کے لیے کافی  
موتے ہیں، مولانا کے ذہن میں معمولی سا ارتعاش بھی نہ پیدا کر سکتے تھے۔ یہ خوبی مولانا کے فکر اور  
سیرت میں ہر جگہ دیکھی جاسکتی ہے۔

البیرونی کا علمی مقام | مولانا آزاد نے اس کتاب میں البیرونی کے کام کی خوب داد دی ہے اور

جغرافیہ و ہیئت کے علماء میں، نہ صرف متقدمین میں بلکہ معاصرین اور متاخرین میں بھی اس کے امتیاز  
کو نمایاں کیا ہے اور اس کے کام کو ایک غیر معمولی عالم و محقق کے کام سے تعبیر کیا ہے لیکن وہ اس  
کی جس خوبی سے بہت زیادہ متاثر ہیں وہ اس کا انداز فکر و تحقیق ہے مولانا اس کی تحقیقات سے زیادہ  
اس کی دماغی سیرت کے مداح ہیں۔ انہوں نے اس کے نتائج تحقیق سے کئی جگہ پر اختلاف کیا ہے لیکن اس کی  
دماغی خوبی اور اس کی سائنٹی فک اپدہج کے بیان میں وہ ہر جگہ رطب اللسان ہیں۔ اس کتاب میں متعدد  
مقامات پر انہوں نے اس کی اعلیٰ دماغی کی خوب خوب تحسین کی ہے۔ ایک جگہ اس کے دماغی خصائص  
کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے کہ وہ ایک محقق اور مجتہد تھا۔ اس نے ہر ماہ کی تحقیقات کو نقل کر دینے ہی  
پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود اپنی ذاتی تحقیق و کاوش سے جغرافیہ کے فن کو از سر نو مدون کر دیا۔ (ص ۴۲)  
ایک اور جگہ لکھا ہے کہ اس نے وسط ایشیا، افغانستان، چین اور ہندوستان کے بارے میں تفصیلی معلومات مہیا

کیوں اور ہر اہم مقام کی نسبت سائنٹی فنک طریقے سے جس قدر صدی تحقیقات کی جا سکتی تھیں وہ سب انجام دیں، ایک مقام پر "البیرونی کا علمی کارنامہ" کے عنوان سے اس کی خدمات، ان کی نوعیت اور خصائص پر دفعہ وار روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا نے البیرونی کی سب سے بڑی خصوصیت پر قرار دی ہے کہ اپنی تحقیقات کے ہر گوشے میں وہ ایک خالص سائنٹی فنک معیارِ نظرِ ہر بات کو لیتا ہے اور کسی دوسرے غیر علمی عنصر کا اثر قبول کرنے سے قطعاً سکر ہے۔ اس نے ہر طرح کی دہم پرستیوں اور مذہبی زد و اعتقادیوں کے خیالات سے جغرافیائی معلومات کو یک قلم پاک کر دیا (ص ۶۲) آگے چل کر البیرونی کی اس خصوصیت پر انہوں نے مزید روشنی ان الفاظ میں ڈالی ہے :

"البیرونی فنِ جغرافیہ کے ازمندہ وسطی کی تاریخ میں پہلا شخص ہے جس نے قدماء کے یہ تمام نقائص صحتِ نظر کے ساتھ معلوم کیے اور پھر صحتِ رصد و مشاہدہ کے ساتھ انہیں دور کر کے جغرافیہ کو ٹھوس سائنٹی فنک بنیادوں پر جمادیا اسے قدماء سے جو کچھ ملا تھا وہ شکوک و اختلافات سے آلودہ تھا اور تخمین و قیاس کی پابندیوں سے قدم قدم پر رکاوٹیں حایل ہو گئیں تھیں۔ اس نے اپنے بعد کے زمانے کے لیے جو کچھ چھوڑا وہ نہ صرف اختلافات و شکوک کی آلودگیوں سے پاک ہو چکا تھا بلکہ تخمین و قیاسات کی پابندیوں سے بھی آزاد تھا خالص عقلی نظر و استدلال اور بے میل رصد و مشاہدہ اس کی تمام جغرافیائی سرگرمیوں کا غیر متزلزل معیارِ عمل رہا اور یہی اس کے علمی کارناموں کی اصلی خصوصیت ہے۔" (ص ۷۲)

مولانا کو اس راہ کی مشکلات کا بھی اندازہ تھا چنانچہ آگے چل کر جہاں مولانا نے موجودہ زمانے اور البیرونی کے رصد و مشاہدہ کے مطابق مختلف شہروں کے عروض و اطوال کے فرق کی نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ اس نے غزنی، کابل، جلال آباد، لغمان، پشاور، دہلی، ہند، حبلیم، قلعہ نندنہ، ملتان، سیالکوٹ وغیرہ کے جو عروض و اطوال تحریر کیے ہیں ان میں اور موجودہ زمانے کی تحقیقات و تعینات میں بہت تھوڑے درجوں کا فرق ہے۔ اس فرق کے لیے مولانا نے البیرونی کا دفاع کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ تمام عروض و اطوال اس کے ذاتی رصد و مشاہدہ کا نتیجہ نہیں ہو سکتے اس نے ہندوستان کے راولوں اور سیاحوں کے بیانات کو لیا ہو گا اور بلاشبہ اس کے سائنٹی فنک دماغ نے روایتوں کی جانچ پڑتال میں کمی نہیں کی ہو گی لیکن معاملہ کی نوعیت ایسی تھی کہ بغیر ذاتی رصد و مشاہدہ کے حقیقتِ حال کا علم حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کتاب الہند میں خود کہتا ہے کہ ہندوستان کے راولوں اور سیاحوں کے بیانات کے حقیقتِ حال کا علم حاصل کرنا نہایت درجہ دشوار ہے۔ ان کے بیانات طرح طرح کی غلط فہمیوں، دہم پرستیوں اور مبالغہ آرائیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں اور سامع کے لیے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ



روایت کا کتنا حصہ اوہام و خرافات پر مبنی ہے اور کتنا حقایق نفس الامری پر (ص ۸۷) یہ بات چونکہ مولانا کے خاص ذوق کی تھی اس لیے انھوں نے بار بار اور اسلوب بدلا بدلا کر اسے بیان کیا ہے۔ اس سے آگے البیرونی کی دماغی سیرت کے عنوان سے ایک مستقل باب میں اس بحث کو پھر پھیر دیا ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

”البیرونی کی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا بے لاگ علم، یعنی سائنس، فک، دماغ ہے۔ اس کی یہ خصوصیت ہر جگہ اس کے ساتھ آتی ہے۔ کوئی دینی عقیدہ، کوئی قومی روایت، کوئی تاریخ، مسلمہ اس کی اس خصوصیت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اس کی عقلیت بے لچک، بے دماغ اور نامکمل التجیر ہے۔ (ص ۱۰۵)

البیرونی کی اس خصوصیت کو ثابت کرنے کے لیے کتاب البیرونی اور الجاہری مرفیہ البواہر سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ آخر میں ایک ماہر طبیعیات منصور بن طلحہ کے بارے میں اس کا ایک بیان نقل کیا ہے اور اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

”مردنیہ، ایک مثال اس کے لیے کافی ہے کہ البیرونی کا دماغ اپنے علم فیہولوں میں کس درجے محتاط تھا اور کس طرح ہر معادلت کو بے لاک علمی اور خالص عقلی نقطہ نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ (ص ۱۱۱)

البیرونی کا امتیاز مولانا نے البیرونی کے امتیاز اور عظمت علمی کو اس طرح بھی نمایاں کیا ہے:

”محققین با قبل البیرونی (۷۸۰ء تا ۱۱۲۰ء) الا صخری (چوتھی صدی ہجری) اور البیرونی (۶۶۰ء - ۱۱۰۰ء) البہدانی (ابن خردادبہر ۹۱۲-۸۲۶) اور محققین، ابعد الیا قوت (ابو عبد اللہ شہاب الدین ۵۷۵ء تا ۶۰۰ء)، نصیر الدین (۷۴۰-۱۲۰۱)، قزوینی (زکریا بن محمد، ۸۳-۱۲۰۴) ابو الفدا (۱۲۳۱-۱۲۷۲)، الخ بیگ (۱۲۲۹-۱۲۹۲)، قوشچی (دغیرہ کے کاموں اور کارناموں سے موازنہ کر کے البیرونی کے دماغ اور اس کے کاموں کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور بعض دوسرے علوم کے متحقیقین کی مثالیں دے کر البیرونی کی محققانہ اور مجتہدانہ نظر و بصیرت کا نقش اجاگر کیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا نے ابوالنصر فارابی (۹۹۰-۸۷۰) اور ابن رشد (۱۱۲۶-۱۱۹۸) سے خاص طور پر مثال دیا ہے۔ کہ جس طرح یونانی تراجم کی نظر ثانی ابوالنصر فارابی نے کی ابن رشد نے ارسطو کے مقالات کی

نے البہدانی (بدیع الزمان) ۱۰۰۷-۹۶۹) صرف شاعر تھا۔ البیہدانی (القاسم ابن محمد ابن ہشام اور ابو محمد الحسن ابن احمد بن یعقوب) کے عرف سے دسویں صدی عیسوی میں دو شخص گزرے ہیں۔ مولانا آزاد کا اشارہ شاید انہی دو میں سے کسی کی طرف ہو۔

شرحیں لکھ کر ان کے مطالب واضح کیے اور یونانی طب کو منقح و تہذیب کر کے اپنی کتاب "القانون" کو ازمنہ  
 وسطیٰ کے درس و تدریس کے لیے پیش کر دیا اسی طرح ہندی علوم کی اصلاح و تہذیب کے لیے بھی  
 ایک ابوالنصر اور ابن رشد کی جگہ خالی رہ گئی تھی یہ کارنامہ البیرونی نے انجام دیا۔ مولانا لکھتے ہیں:  
 "اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو البیرونی کی شخصیت میں اس کے عہد کی یہ علمی روح پوری طرح  
 نمایاں ہوئی تھی اور وہ بجا طور پر الفارابی اور ابن رشد کی صف میں جگہ پانے کی مستحق ہے جس  
 طرح ان دونوں نے یونانی فلسفہ کے تراجم کی تصحیح کا کام انجام دیا تھا اسی طرح البیرونی نے  
 علم ہیئت اور جغرافیہ کی از سر نو تصحیح و تہذیب کی اور ہندوستانی علوم کو نئے سرے سے عربی  
 میں مدون کیا۔ لیکن البیرونی اس صف میں نمایاں ہونے کے ساتھ اپنی ایک بلند تر جگہ بھی  
 رکھتا ہے۔ ابوالنصر فارابی اور ابن رشد دونوں اس زبان سے ناواقف تھے جس زبان کے  
 فلسفے کی تصحیح و تہذیب میں مشغول ہوئے تھے۔ انہوں نے تمام تر اعتماد عربی کے قدیم  
 تراجم پر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصحیح مکمل تصحیح نہ ہو سکی اور بعض غلط فہمیاں جو عہد تراجم  
 کے ابتدائی دور میں پیدا ہو گئی تھیں آخر تک دور نہ ہو سکیں..... لیکن البیرونی نے  
 نظر و تحقیق کی بالکل دوسری راہ اختیار کی۔ اس نے جن علوم کو اپنا موضوع نظر قرار دیا  
 انہیں خود ان کی اصلی زبانوں میں پڑھنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کے علوم کی اس نے  
 جس قدر تحقیقات کی سنسکرت کی تحصیل کے بعد کی۔ فارسی، خوارزمی اور جرجانی زبانیں  
 اس کے لیے بمنزلہ مادری زبانوں کے تھیں۔ اس لیے قدیم ایرانی تاریخ و سنسکرت کی تحقیقات  
 میں اسے کسی درمیانی وسیلے کا منت پذیر نہیں ہونا پڑا۔ جہاں تک یونانی اور سریانی  
 زبانوں کا تعلق ہے گو کوئی براہ راست تصریح ہمیں نہیں ملی ہے لیکن الاشارات الباقیہ میں اس  
 نے اپنی تحقیقات کا جس پیرایے میں ذکر کیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ غالباً وہ ان  
 دونوں زبانوں سے ناواقف نہ تھا۔ عبرانی زبان سے اس کی ذاتی واقفیت کی تصریح خود  
 اس کے قلم سے نکلی ہوئی ہمیں مل گئی ہے۔ بلاشبہ ہے کہ جو شخص سنسکرت، یونانی، سریانی، فارسی  
 اور عبرانی زبانوں سے براہ راست واقفیت رکھتا ہو اس کی علمی حیثیت کے مقابلے میں الفارابی  
 بوعلی سینا اور ابن رشد وغیر ہم کو لاکسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا۔ ان اکابر کا علمی پایہ  
 کتنا ہی بلند ہوتا تھا ہم ان کا تمام علمی سرمایہ عربی ترجموں کے رحم پر تھا۔ وہ براہ راست  
 نظر و تحقیق کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اس میں کوئی

شہ نہیں کہ عربی کی پوری علمی تاریخ میں البیرونی کا مقام یک قلم منفرد نظر آتا ہے۔ (صفحہ ۶۳)

البیرونی کے بعض تسامحات مولانا آزاد نے اس مقالے میں البیرونی کے کارناموں کی صرف تعریف ہی نہیں کی بلکہ اس کے بعض تسامحات پر بھی روشنی ڈالی ہے لیکن اس باب میں انہوں نے البیرونی کی معذوری کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس کی معذوری کی اصل وجہ ہندوستان میں پھیلے ہوئے ان توہمات و خرافات کو بھی قرار دیا ہے جنہوں نے مسلمات کا درجہ حاصل کر لیا تھا اور سیر و سیاحت کی معلومات اور رصد و مشاہدہ کے وسائل کی کمی بعض قیاسات کو بھی قرار دیا ہے۔ مثلاً سیلون کے قبتہ الارض ہونے کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمی میں البیرونی کے مبتلا ہو جانے کا ذکر کیا ہے مولانا لکھتے ہیں:

”عربی میں چونکہ فلکیات کے مباحث پہلے پہل ہندی علم ہیئت کے دروازے سے آئے تھے اور دوسری صدی ہجری میں موسیٰ بن محمد الخوارزمی نے برہم گپت کی سدھانت کے مطابق علم ہیئت کے مباحث ترتیب دیے تھے اس لیے یہ غلطی عربوں میں بھی پھیل گئی اور انہوں نے سیلون کو قبتہ الارض کے نام سے تعبیر کرنا شروع کر دیا۔ البیرونی نے اگرچہ سیلون کے قبتہ الارض ہونے میں شبہ ظاہر کیا ہے اور اس بارے میں جو توہمات ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے انہیں خرافات سے تعبیر کیا ہے تاہم حساب کی اصلی غلطی پر وہ بھی متنبہ نہ ہو سکا کیونکہ اس زمانے میں سیر و سیاحت کے وسائل اور صدی اعمال کے طریقے اس درجہ محدود تھے کہ اس طرح کی غلطیوں کی درستگی باسانی نہیں کی جا سکتی تھی۔“ (۷۹)

مولانا نے البیرونی طول بلد اور عرض بلد کے بعض تسامحات کی نشاندہی بھی کی ہے، لیکن اس کا سبب بھی بتا دیا ہے:

”ایک بڑی دشواری اسے یہ پیش آئی کہ ہندوستان کے شہروں کی باہمی مسافت کی نسبت راولوں کے بیانات بے حد مختلف تھے اور جمع و تطبیق کا کوئی قابل وثوق ذریعہ موجود نہ تھا۔۔۔۔۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ طرح طرح کی غلطیاں حساب میں سرایت کر جائیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی غیر معمولی کوشش و احتیاط بھی اسے صورت حال کے قدرتی نقائص سے نہ بچا سکی اور مساحت کے اندازوں میں غلطیاں واقع ہو گئیں۔ مثلاً موجودہ ٹینہ تقریباً ۱۵۱ محل پر واقع ہے جہاں قدیم عہد کا پاٹلی پتر آباد تھا۔ ٹینہ کا طول بلد ۵۸-۱۲ اور عرض بلد ۲۵-۲۷ ہے۔ البیرونی پاٹلی پتر کا طول بلد ۱۰۸-۲۰ لکھتا ہے اور عرض بلد ۲۲-۲۰، صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں جو روایتیں اس تک پہنچی تھیں وہ اہمیت کو صحت

کے راتھ واضح نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے بنارس سے پانچ پتر تک کا فاصلہ بیس فرسخ عربی قرار دیا ہے اور بنارس سے اسے یورپ میں ہٹا ہوا تصور کیا ہے حالانکہ یہ دونوں باتیں صحت سے دور ہیں۔ ایسا ہی فرق کنگا ساگر کے محل وقوع میں بھی پڑ گیا۔ کیونکہ صحیح فاصلہ اور صحیح جہت اس کے علم میں نہ آ سکی تھی۔ (۸)

البیرونی کے تصانیف کے سلسلے میں مولانا نے سیلوں کے بارے میں کتاب الهند باب ۳۰ کی مثال دی ہے کہ اس وقت تک ہندوستان کے لوگوں کے دماغ میں پرانوں اور راہین کی کہانیوں نے ایسا روبرو کر دیا تھا کہ نہ صرف عام لوگوں کا بلکہ پنڈتوں تک کا عام خیال یہی تھا کہ لنکا میں سفیریت بستے ہیں اور انساں کا وہاں جا کر زندہ واپس آنا بہت دشوار ہے۔ اس وقت تک عرب سیاحوں کے قدم بھی سیلوں کی سیر و سیاحت سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ وہ اسے سنگل دیپ کے نام پر پہچانتے تھے اور اس کے ساحل سے گزرتے ہوئے راجہ مقامات کی بعض پیداوار بھی حاصل کر لیتے تھے لیکن وہاں کے لوگوں سے راہ درسم پیدا کرنے کا کوئی صورت اس وقت تک نہ نکلی تھی اس لیے افسانوی روایات ان میں بھی پھیل گئی تھیں اور وہ ہندو افسانے کے متوہمہ قلعے کے بارے میں خیال کرتے تھے کہ وہ اسی مقام کے کسی حصے میں ہے۔ البیرونی ان افسانوں سے جو تاریخ کے مسلمات کی طرح مشہور تھے دعو کے میں پڑ گیا مولانا کہتے ہیں:

”البیرونی نے عرب سیاحوں کی زبانی ایک اور پراسرار جزیرے کا حال نقل کیا ہے جہاں سے وہ اپنے جہازوں پر لوگ (قرنفل) بار کیا کرتے تھے اور پھر کہا ہے عجیب نہیں ہی جزیرہ لنکا ہو اور پھر لنکا اور لونگ کی لفظی مشابہت سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ ”لونگ“ لنکا سے مشتق ہوا ہے۔ حالانکہ ”لونگ“ کو لنکا سے کو تعلق نہیں۔ اس نے کتاب الهند کے اسی باب میں ہندو افسانے کے متخیلہ قلعے کا جس کی کوئی اصلیت نہ تھی، ایک نقشہ بھی دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندو افسانوں میں لنکا اور سنگل دیپ کو دو الگ الگ مقاموں کی شکل دی گئی ہے اس نے القانون کی جدول میں لنکا اور سنگل دیپ کے لیے دو مختلف درجے متعین کیے ہیں جو جدول خط استوا پر بلد عرض کے مقامات کی بنائی ہے، اس میں لنکا کا طول بلد ۱۰۰ لکھا ہے۔ پھر ان مقامات کی جدول میں جو اقلیم اول اور خط استوا کے درمیان واقع ہیں، سنگل دیپ اور سراندریپ کا ذکر کیا ہے اور اس کا طول بلد ۱۲۰ اور عرض بلد ۱۰ درجے کا لکھا ہے۔ وہ لنکا کو مجہولات میں سے قرار دیتا ہے۔ مگر سنگل دیپ کو مجہول نہیں کہتا۔ اسے بحر ہر کند کے

جزائر میں شمار کرتا ہے۔ بہر حال وہ اس مقام کی صحیح تحقیق نہ کر سکا۔ (۸۰)

ایک اور مقام پر سندھ ہند کی اصل سمجھنے میں البیرونی کے تسامح کی طرف بھی مولانا نے توجہ دلائی ہے۔ اس موقع پر لہجائیات کی ایک چھوٹی سی تحقیق بھی مولانا نے پیش کر دی ہے۔ اور اس قسم کی تحقیق کی یہ کوئی واحد مثال نہیں۔ متعدد مقامات پر اس قسم کی تحقیقات سامنے آتی ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

”سندھانت کے معنی سنسکرت میں علم و معرفت کے ہیں۔ نیز اس کا اطلاق علم و فن کے کسی خاص مندرجہ اور اصول پر بھی ہوتا ہے۔ پس براہم سمجھتہ سندھانت کے معنی ہوئے علم ہیئت کا وہ مذہب جو براہم گپت کی طرف منسوب ہے۔ عربوں نے نام کا بقیہ جزر حرف کر دیا اور پھر سندھانت کو جس کی مخلوط والی ان کی زبان کے لیے بہت تھیل تھی سندھ ہند بنا لیا۔ البیرونی پر اس لفظ کی اصلیت مشتبہ ہو گئی تھی۔ اس کا خیال ”سندھانت“ کی طرف نہیں گیا بلکہ ایک دوسرے سنسکرت مادے ”سندھانت“ کی طرف چلا گیا۔ سندھانت کے معنی استقامت یعنی سیدھے ہونے کے ہیں اور اسی سے ہر اکرت زبانوں میں ”سیدھ“ اور ”سیدھے“ کا لفظ بنا ہے۔ چنانچہ کتاب البند میں وہ لکھتا ہے کہ عربوں میں ”سندھ ہند“ کے نام سے جو مذہب مشہور ہوا وہ دراصل سندھانت ہے یعنی ایسا بات جس میں کسی طرح کی کجی نہ ہو۔ (ص ۵۶)

اسی طرح ہندوستان کے مقام آجیر، کے عربی تلفظ اور تھیف کے عمل سے مطالب کے فہم میں بھی پیدا ہوا ہے۔

پیدا ہو گئیں حتیٰ کہ ایک وقت آیا جب اس کے معنی یکسر بدل گئے مولانا نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

**بعض مباحث کی تحقیق** | مولانا نے البیرونی کی زندگی کے بعض حوادث و مصائب سے متعلق اس اشارت کی وضاحت اور ان کی تحقیق بھی کی ہے مثلاً ہندوستان میں اس کے مقامات سفر و سیاحت اور محمود غزنوی سے اس کے تعلقات، انوعیت کے بارے میں مولانا نے جو کچھ لکھا ہے وہ تحقیق کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔

بعض مقامات پر مولانا نے البیرونی کے بیان کو نقل کر دینے یا اس کی خصوصیت کی طرف توجہ دلانے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس پر مزید اضافہ بھی کیا ہے اور مدلل و مبہین کر دیا ہے۔ اسی قسم کا ایک مقام ”سنگ بدہ“ کی بحث میں آتا ہے۔ البیرونی نے اس مسئلے پر جو کچھ لکھا مولانا نے اس کے آثار کی تمہید میں ایک بحث کا اضافہ کیا ہے۔ اب یہ ایک مختصر سا مستقل مبحث اس مقالے میں ہے جس سے اس مسئلے کے اطراف و جوانب سامنے آجاتے ہیں۔

**مولانا کا حسن نگارش** | مولانا آزاد کے اس مقالے میں اگرچہ ان کا قلم علمی مباحث کے زیر اثر رک رک کر چلا ہے اور انشا پر از می کا حسن اگرچہ غبارِ خاطر کے درجے کو نہیں پہنچتا لیکن ان کے قلم کی

بروت کاری کا عالم یہ ہے اور اسلوب کی جلوہ طرازی ایسی ہے کہ وہ نگاہِ جمال آشنا اور دیدہ حسن پرست کو بار بار اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ اس مقالے سے اس کی چھوٹی بڑی بہت مثالیں پیش کیا جاسکتے ہیں یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱- ”جو مایوسی ایلٹ کے حصے میں آئی تھی وہ آگے چل کر ان تمام مستشرقوں کے حصے میں آنے والی تھی جو ایلٹ کے نقش قدم پر اٹھانے والے تھے“ (ص ۲۵)

۲- ”بطلموس کے جغرافیہ کی تدوین کے بعد طرح طرح کے انقلابوں سے دنیا دوچار ہوئی بہت سے پرانے شہر مٹ گئے اور ان کی جگہ نئے نئے شہر آباد ہو گئے۔ بعض دریاؤں کی دھاروں نے اپنی قدیم راہیں بدل دیں اور نئی نئی راہوں پر چلنے لگے۔ اسلام کے ظہور کے بعد انقلابِ حال نے ایک دوسرا درق الٹا اور ایشیا اور افریقہ کی بہت سی آبادیاں کچھ سے کچھ ہو گئیں۔ عراق میں قدیم ایرانی شہنشاہی کا دار الحکومت دیران ہو گیا اور بصرہ، کوفہ اور بغداد کے ناموں سے نئے شہر بس گئے۔ مصر میں ”منفس“ کا جگہ فسطاط نے، اور ایران میں ”استخر“ کی جگہ شیرازہ نے سر اٹھایا، مراکش، اسپین، وسط ایشیا اور سندھ میں بھی نئی عربی نوآبادیاں نمایاں ہوئیں اور جغرافیہ کے نقشوں میں بے شمار نئے مقامات اور نئے نام پیدا ہو گئے۔ ان آبادیوں کے جغرافیہ نگاروں کا انہیں قدیم یونانی معلومات نہیں کر سکتی تھیں اور ضروری تھا کہ نئی تحقیقات کے ذریعے ان کے اطوال و عرض متعین کیے جائیں“ (ص ۷۲)

۳- ”البیرونی نے اپنی علمی جدوجہد ہر طرح کے موافق و مخالف حالات میں یکساں عزم و ہمت کے ساتھ جاری رکھی اور وقت کا کوئی ہنگامہ اس کے ذوقِ تحقیق کی طلب گاریوں پر غالب نہ آسکا“ (ص ۹۱)

۴- جس وقت خوارزم کا سرزمین قتل و نہب کا یہ کھیل کھیل رہی تھی۔ البیرونی اس کی آبادیوں کے باہر ایک گاؤں کے میدان میں اپنی رصد بندیلوں کے پر سکون اعمال میں مشغول تھا۔ جس دن امیر مامون نے کاش کے شاہی محل میں ابو عبد اللہ کو گرفتار کیا اسی دن البیرونی نے اپنی رصد گاہ کو ایک نئے دائرہ قطر اور اس کے متعلقہ آلات سے آراستہ کیا تھا اور زمانے سے صرف اتنی مہلت کا آرزو مند تھا کہ اسے اپنے رصدی عالیہ کے نتائج قلم بند کرنے کا موقع مل جائے۔ و ما حسن ما قبل بالفارسیہ

نہ گویم اسے فلک کز کج بردی ہایت تو بر گردی  
شب وصل ست خواہم این قدر آہستہ تر گردی

لیکن افسوس ہے زمانے کے بے رحم انقلابات نے اسے اتنی مہلت بھی نہ دی۔ (ص ۹۲)

۵۔ علوم فلکیہ کی تاریخ کا یہ ایک مسلمہ واقعہ ہے کہ علم ہیئت اور فن نجوم یعنی سعادت و نحوت کو کب کے فن کا باہمی فرق مدتوں تک غیر واضح رہا۔ جو امتیازی خط دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے، وہ قدیم زمانے میں اتنا باریک تھا کہ عام نگاہیں بہت کم اسے محسوس کر سکتی تھیں اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہیئت کے ماہر کو فن نجوم کا ماہر سمجھ لیا جاتا تھا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابو محمد الخجندی ابن جابر البتانی، ابو معشر الفلکی، عمر الخیام، نصیر الدین الطوسی وغیر ہم جنہیں فن نجوم کے ادہام و خرافات سے کوئی دور کا بھی تعلق نہ تھا محض اس لیے نجومی مشہور ہو گئے کہ لوگوں نے ان کی نگاہیں ستاروں کی طرف اٹھی ہوئی دیکھیں تھیں اور وہ خیال کرتے تھے کہ ستاروں کی حرکات کا مطالعہ صرف اس لیے کیا جاسکتا ہے کہ فن نجوم کا اعتقاد اسی رخ پر لے جاتا ہے۔ نظامی سمرقندی اور صاحب نگارستان نے البیرونی کی نسبت جو حکایتیں لکھی ہیں ان کے اندر بھی یہی غلط فہمی کام کر رہی ہے۔ البیرونی کے بے لاگ علمی دماغ کا تو یہ حال تھا کہ جس شخص کو ریاضی و ہیئت کے ساتھ فن نجوم کے اعمال و احکام سے بھی دلچسپی ہوتی وہ اس کے بیانات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگتا کیونکہ وہ خیال کرتا کہ بہت ممکن ہے فن نجوم کے عقیدے سے اس کا رصدی عمل غیر محسوس طریقے پر متاثر ہو گیا ہو۔ چنانچہ اس نے نیشاپور کے طول بلد کی بحث میں منصور بن طلحہ کی تصریح کو صرف اس لیے مشکوک ٹھہرایا کہ کان مولعا۔ لعلم النجوم، وہ علم نجوم سے دلچسپی رکھتا تھا لیکن زمانے کا غلط اندیشیوں کا یہ تصرف دیدنی ہے کہ ایسا محتاط شخص بھی نجومی ہونے کے اہتمام سے محفوظ نہ رہ سکا، وللدرد ما قال،

مریم ابن راتھل شد و عیسیٰ برداشت (ص ۹۸)

۶۔ یہ روایت کہ سلطان محمود نے البیرونی کی جان بخشی اس کے نجومی ہونے کے خیال سے کی بھیج ہو یا نہ ہو لیکن سلطان کی دماغی استعداد پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ البیرونی کے علمی مقام کی اندازہ شناسی کے لیے وہ قطعاً غیر مستعد تھا اور اس کے فلکی اعمال و انہماک کو صرف اسی صورت میں دیکھ سکتا تھا کہ اسے نجومی تصور کر لے۔ اس سبب زیادہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے لیے اس کے پاس کوئی دماغی استعداد نہ تھی۔ اس صورت حال میں بھی ہمیں البیرونی کے احساسات کی تلخی اور مایوسی صاف صاف نظر آجاتی ہے۔ ایک ایسے بادشاہ کی سرپرستی اسے کیونکر سلیس اور خوشحال کر سکتی تھی جو ریاضیات اور ہیئت کے ایک باکمال شخص کی قدر شناسی کے لیے کوئی ذہنی استعداد نہیں رکھتا تھا اور اگر قدر شناسی کے لیے آمادہ بھی ہوتا تھا تو صرف اس لیے

کہ اسے فنِ نجوم کے ادہام و خرافات کے اعتقاد سے متہم تصور کر لے۔ (ص ۱۹)

مولانا کا حسن ترجمہ | اس مقالے میں حسن ترجمہ کی بھی متعدد مثالیں سامنے آتی ہیں۔ مولانا آزاد کے ندرہ کار قلم سے عربی کی طویل طویل عبارتوں کا ترجمہ جگہ جگہ پر اس مقالے میں دیکھنے میں آتا ہے۔ ترجمے میں چونکہ قلم دوسرے کے فکر و مفہوم اور اسلوب کا پابند ہوتا ہے اس لیے ترجمے کے تقاضوں سے ہمہ براہ ہوتے ہوئے انشاء پر داری کا میدان تنگ رہتا ہے اور کوئی ایسا مترجم جو بیک وقت اور یکساں طور پر دونوں زبانوں کا ذوق آشنا نہ ہو اور نظر و عبور میں اپنا ایک بلند مقام نہ رکھتا ہو، کامیاب نہیں ہوتا۔ وہ فکر و مفہوم پر نظر رکھتا ہے تو سررشتہ اسلوب و نگارش ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور ترجمہ کی زبان کے اسلوب و انشا کے حسن و زیبائش کو توجہ کا مرکز بناتا ہے تو مصنف کے فکر و مفہوم اور اسلوب سے دور جا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں بہت کم ادیب کامیاب ہوتے ہیں مولانا آزاد کا شمار ان مستثنیٰ شخصیات میں ہوتا ہے جو ایک مصنف کے افکار و مفہوم کی صحیح ترجمانی کے ساتھ اسلوب کے معیار اور نگارش کے حسن کو بھی ترجمہ کی زبان میں نہ صرف برقرار رکھتے ہیں بلکہ اسے چار چاند لگا دیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا کے اسلوب کی سحر انگیزی اور نگارش کی دل آویزی کا جو عالم ہم ان کی تحریر میں دیکھتے ہیں وہ ترجمے میں بھی موجود ہے۔

بعض ضمنی مباحث | اصل مباحث کے علاوہ بے شمار ضمنی افکار و مباحث بھی اس مقالے میں آگئے ہیں ان میں سے بعض ایسے افکار بھی ہیں کہ مولانا کی کسی اور تحریر میں ان کی تلاش بے سود ہے۔ مثلاً ترکی میں قومی بان کے رسم الخط کی تبدیلی کے اقدام کی سنگینی پر تبصرے میں مولانا کے فکر کا جو گوشہ پہلی بار تاریخ کی روشنی میں آیا ہے، یا کم از کم میرے مطالعے کے سفر میں یہ مقام پہلی بار میری نظروں نے دیکھا اس کے چند جملوں میں عبرت اور سبق آموزی کے کتنے ہی دفتر سمٹ آئے ہیں۔

”حکومت ترکی نے حروف کی تبدیلی کا فیصلہ جن اصلاحی مقاصد کے ماتحت کیا اس کی

نسبت یہاں الہامی اے کی ضرورت نہیں ہے لیکن کوئی اصلاح کتنی ہی اہم ہو اگر اس کے غلو

کو مجنونانہ انتہا تک پہنچا دیا جائے گا تو وہ اصلاح نہیں رہے گی بجائے خود ایک افساد بن

جائے گی۔ حروف کی تبدیلی کا کام بغیر اس کے بھی انجام پا سکتا تھا کہ عربی حروف ملک سے

جلا وطن نہ کر دیے جاتے اور عربی کتابوں کی طباعت کو جرم نہ قرار دیا جاتا۔ (ص ۵۴)

اسی طرح استنبول اور قونیا کے کتب خانوں کی تاریخ، ان کے انتشار کی کہانی، پھر دوبارہ ان کی ترتیب

زرد اور کا جو تفصیلات مولانا نے بیان کی ہیں۔ وہ اس کتاب کے موضوع سے الگ ایک مستقل درپوش

موضوع ہے۔ اسی طرح البیرونی کی القانون المسعودی کی جداول کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے

136086



مولانا نے البیرونی سے پہلے عربی میں فن جغرافیہ اور علم ہیئت کے آغاز و ارتقاء پر نظر ڈالی ہے۔ اس کے بغیر البیرونی کی تحقیقات کی علمی حیثیت کا صحیح اندازہ نہیں جاسکتا تھا۔ اس سلسلے میں عربی میں ہیئت کا پہلی کتاب اس کا تصنیف حیثیت، اس کے مباحث، اس کی خصوصیات، اس کی غلطیاں، ہندوستانی کلیپ کا حساب، ہندی گیگ اور ہائیگ، قبة الارض کی بحث، علم ہیئت کی مختلف شاخوں میں کام کا ذکر، عربی میں دنیا کے پہلے نقشے کی تشکیل اور اس کی خصوصیات کا ذکر اور ہندی حساب کی غلطیاں، یہ تمام مباحث ایسے ہیں جو اس مقالے کو ایک خاص معیار کی تحقیقی اور تصنیف کا کارنامہ بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح علومِ لکھیہ کا تاریخ کی یہ غلط فہمی کہ بہت سے ایسے لوگوں کو جن کا تعلق علم نجوم سے نہ تھا انھیں نجوم سمجھ لیا گیا۔ اس بحث کا تعلق بھی مقالے کے خاص دائرے سے نہ تھا لیکن مولانا کے قلم کی یہ خصوصیت کہ وہ دورانِ بحث میں اصل بحث کے علاوہ بہت سے ضمنی و ذیلی مباحث پر روشنی ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور آخر میں بحث کے تمام اطراف و ہونہا کو سمیٹ کر اسی نقطے پر لے آتے ہیں جسے وہ پہلے سے اپنے مقاصد تحریر کا مرکز قرار دے چکے ہوتے ہیں، اس مقالے میں مولانا کی یہ خوبی متعدد مقامات پر نمایاں ہوتی ہے۔ مولانا نے بحث کو مختلف گوشوں اور سمتوں میں پھیلا پھیلا کر سمیٹ لیا ہے اور قاری کے ذہن میں مطالب کے شیرازے کو کئی جگہ لکھ کر دینے کے باوجود بحث کے اصل نقطے کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔

اصطلاحات کا استعمال | کسی علم و فن کی کتاب میں اصطلاحات کے استعمال سے اسلوب میں ایجاز و اختصار کا حسن پیدا ہو جاتا ہے لیکن ایک مصنف کے نظر و عبور کی یہ آزمائش گاہ بھی ہے۔ ایک اصطلاح کا غلط یا خلاف محل استعمال تمام مطالب کو ضبط کر دینے کے لیے بھی کافی ہوتا ہے۔ اس مقالے میں اصطلاحات کا استعمال مولانا کے اسلوب کی خوبی اور نظر و عبور کے ثبوت کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ مولانا کو جغرافیہ اور ہیئت سے شروع ہی سے دلچسپی تھی اور زندگی کے بعد کے کسی دور میں بھی شاید ہی وہ ان علوم کے مطالعے سے بے نیاز رہے ہوں۔ اس کا اندازہ کچھ اس مقالے کے مطالعے ہی سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا نے جغرافیہ کی بہت سی اصطلاحات کو استعمال کیا ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ نہایت صحت کے ساتھ اور بر محل استعمال کیا ہے۔ مولانا کی اس خوبی نے مقالے میں ایک خاص علمی شان پیدا کر دی ہے اس سے اسلوب میں ایجاز کا حسن اور دل ربائی کی خوبی بھی بڑھ گئی ہے۔

آخری نظر | البیرونی کے بارے میں مولانا کی یہ پہلی اور آخری تحریر نہیں۔ جس طرح مولانا کا مطالعہ اور ان کی زندگی میں پھیلا ہے اور ادبی زندگی کے آغاز سے آخر دور حیات تک البیرونی اور

اس کے علوم و افکار مولانا کے مطالعے کا موضوع ہے۔ اس کا تذکرہ بھی مولانا کے قلم سے مختلف ادوار حیات میں ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۰۴ء میں البیرونی کی تصنیف "القانون المسعودی" کے مطالعے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں لیکن اس کے لیے انہیں کامل دو سال کے شب و روز کا شمار کرنا پڑا پھر جب انتظار کی یہ مدت پوری ہوئی تو کتب خانے میں لائبریرین کی حیثیت سے ان کے ایک دوست بھی آچکے تھے۔ یہ دور انتظار و التوا ختم ہوا تب ۱۹۰۶ء میں "القانون" مولانا کے مطالعے میں آئی ایک تئیسک ان کے پاس رہی۔ "الہلال" کی مجلدات میں متعدد مضامین میں البیرونی اور اس کے علوم و افکار کا ذکر یا حوالہ آیا ہے۔ سب سے آخر میں مولانا کے ادبی شاہکار غبارِ خاطر کے آخری خط (۱۹ ستمبر ۱۹۲۳ء) میں دو مقام پر البیرونی اور اس کی کتاب "الہند" کا ذکر آیا ہے۔ ایک ہندوستان کے فنون لطیفہ سے عربوں کی علوم دلچسپی کے اسباب کے ضمن میں جہاں مولانا نے البیرونی کے عمل سے استدلال کیا ہے کہ اس نے کتاب "الہند" میں ہندوؤں کے تمام علوم و عقائد پر نظر ڈالی ہے مگر موسیقی کا اس میں کوئی ذکر نہیں پھر اس تغافل کا خود ہی جواب بھی دیا ہے کہ غالباً اس تغافل کی وجہ کچھ تو یہ ہوگی کہ علوم عقلیہ کے شوق و اشتغال نے اس کی بہت کم مہلت دی کہ فنون لطیفہ کی طرف توجہ کرتے اور کچھ یہ بات بھی ہوگی کہ عربوں کا ذوقِ سماع ہندوستان کے ذوقِ سماع سے اس درجہ مختلف تھا کہ ایک کے کان دوسرے کی نواؤں سے مشکل آشنا ہو سکتے تھے، دوسرے جانوروں پر راگ کے اثرات کے ضمن میں البیرونی نے کتاب "الہند" میں راگ کے ذریعے شکار کے طریقوں اور بندوں پر راماین کے بعض اشعار کی تاثیر کا ذکر کیا ہے۔ مولانا نے البیرونی کی معلومات نقل کر کے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ زمانہ حال کا علم الجیوان نغمہ سرائی کی تاثیر کی واقیعت تسلیم نہیں کرتا اور تاثرات کے مشاہدات کو دوسری علتوں پر محمول کرتا ہے۔ آخر کے چند جملوں میں مولانا نے اپنے مطالعے کی دنیا کا ایک دریچہ کھول دیا ہے جس سے جہانک کہ ہم یہ دیکھ لے سکتے ہیں کہ ان کے جہانِ علم و فضل کا ایک گوشہ یہ بھی ہے۔

## ابوریحان البیرونی

مسلمانوں کی علمی تاریخ میں ہمیں تین دھارے ملتے ہیں جن میں سے ایک مختلف نشیب و فراز سے گزرتا ہوا بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں وقت کے ریگزار میں گم ہو جاتا ہے۔ دو دھارے کچھ دن اور ساتھ ساتھ چلتے ہیں، لیکن پھر ایک اور معدوم ہو جاتا ہے، بس اس کے بعد ایک رہ جاتا ہے جو اب تک جاری ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے:

عام طور پر مسلمانوں کی تمام علمی و فکری سرگرمیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا رہا ہے، ایک علوم نقلیہ اور ایک علوم عقلیہ، لیکن ایک اور حصہ علوم عملیہ کا بھی رہا ہے (اگر یہ اصطلاح وضع کی جاسکے)۔ یوں تو علمی و فکری زندگی میں اکثر اس طرح کی تقسیم مکمل طور پر سائنٹفک قرار نہیں دی جاسکتی، لیکن انہماک و تہنیم کی روایت کچھ اسی طرح کی رہی ہے۔ علوم نقلیہ وہ ہیں جن میں بنیادی طور پر اس تعلق کی تعریف و تحدید ہوتی ہے جو خدا اور اس کی مخلوق اور مخلوق اور مخلوق کے مابین ہونا چاہیے، علوم عقلیہ میں فلسفیانہ افکار اور تصوف کے فکری گوشے شامل ہیں اور علوم عملیہ ہم ان علوم کو کہیں گے جو زندگی کے عملی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں اور ان میں نظری اور اطلاقی سائنس شامل ہے، جیسے طب، ہیئت، طبیعی علوم، ریاضی، انجینئرنگ، علم النجوم، فارمیسی، زراعت، حیاتیاتی علوم اور فن تعمیر وغیرہ۔ یہ علوم وہ ہیں جو علوم نقلیہ سے کہیں متصادم نہیں ہوتے جبکہ فلسفہ اور تصوف کے بعض فکری مباحث علوم نقلیہ کی بعض اہم تاسیسات سے ٹکرا جاتے ہیں اور ان عقائد کو فکر و نظر کا موضوع بناتے ہیں جن کے بارے میں علوم نقلیہ کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں بے چون و چرا تسلیم کر لیا جائے، یہ عقائد و حقیقت مذاہب کی بنیاد ہیں، یہ بنیاد ہل جائے تو مذہب مذہب نہیں رہتا، فکر و فلسفہ بن جاتا ہے۔

تاریخ اسلام میں دسویں اور گیارہویں صدی ترقی علوم کے لحاظ سے، خاص طور پر علوم عقلی اور علوم عملی کی ترقی کے اعتبار سے، بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ علوم نقلی کے شعبے میں بھی بعض ایسے علما اٹھے جن کا اثر علوم نقلی کے علاوہ دوسرے علوم پر بھی گہرا پڑا، لیکن اس موقع پر ان کے علمی کارناموں کو ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ جو زمانہ مسلمانوں کی تاریخ میں سیاسی ابتری اور انتشار کا زمانہ ہے، وہی علم و حکمت کا ایک بے مثل دور بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس دور سے پہلے مسلم معاشرہ سیاسی ہنگاموں فوجی سرگرمیوں، بغاوتوں اور تحالف و تصادم سے پاک تھا، لیکن مجموعی طور پر مرکز میں استحکام تھا۔ عہد اموی ہو یا خلافت عباسیہ کا عہد اولیٰ، یا اندلس میں عربوں کی حکومت کا عہد زریں، ان صدیوں میں سیاسی و فوجی سرگرمیوں کے باوجود عام نضاعلم و حکمت کی ترقی کے لئے سازگار تھی اور مسلمانوں میں قرآنی تعلیمات کے سبب حصول علم کا جو روز افزوں شوق پیدا ہو گیا تھا اس کی معجز نمایاں اس دور میں خوب خوب ظاہر ہوئیں، یہ جو حانی نے کہا تھا کہ

حریم خلافت میں اونٹوں پہ لدر

چلے آتے تھے مصر و یونان کے دفتر

تو اس سے اشارہ بیت الحکمت، بغداد و بصرہ کے علمی مراکز، قرطبہ و غرناطہ کے مدارس اور دارالکتب اور امراء اور علماء کے دیوان اور ذوالی کتب خانوں میں روشن علم و حکمت کی شمع کی طرف تھا جس سے اطراف و اکناف عالم میں علم و تہذیب کی روشنی پھیل رہی تھی۔

تمدن عالم کی تاریخ کا یہ وہ دور ہے جس کی دور رس اور نتیجہ خیز علمی سرگرمیوں کے عالمگیر اثرات سے مسلمانوں کے بڑے سے بڑے دشمن بھی انکار نہیں کر سکتے۔ صحرائے عرب سے اسلام جب نکلا تو ان علاقوں میں پھیلا جو تہذیب و تمدن کے گہوائے رہ چکے تھے، مصر و ایران، عراق و فلسطین وہ علاقے تھے جو کبھی آفتاب تمدن کے آسمان تھے اور نہ معلوم علم و تہذیب اور اقوام و السنہ کے کتنے کارواں ان شاہراہوں سے گزر چکے تھے جن کے ذریعے ایران کے ثقافتی و علمی مراکز کا دجلہ و فرات کی وادیوں، فونیقیوں اور فلسطینیوں کی بستیوں، عیش و فسطاط، اسکندریہ اور وادی نیل کی سرزمین سے رابطہ قائم تھا۔ ایک یونان تھا جو اس وقت مسلمانوں کی کثرتستانی سے محفوظ تھا، لیکن مشرقی رومی سلطنت کے عیسائی تعصب نے وہاں کے عالموں کو یونان کے جنوب میں

شرقی بحیرہ روم کے ان جزیروں اور ساحلی علاقوں میں پناہ لینے اور بسنے پر مجبور کر دیا تھا جہاں اب مسلمان پھیل گئے تھے، یہ یونانی عالم اپنے سینوں اور سفینوں میں یونان کا بچا کھچا علم و فلسفہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ مسلمانوں نے اپنے سیاسی و تمدنی عروج کے اس عہد میں اس صورت حالی سے پورا فائدہ اٹھایا اور چونکہ قرآن نے ان پر قلم اور بیان کی دینی و نبوی اہمیت و اشکاف کر دی تھی، اس لئے عالمگیر جہان بینی کے ساتھ علم و عرفان کی کثرت کثانی بھی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ اور یہ بات دلچسپ بھی ہے اور باعث حیرت بھی کہ سیاسی نشیب و فراز، مرکزی حکومت کی کمزوری اور عمومی انتشار اور امراء و سلاطین کی علاقائی، خاندانی، نسلی اور کبھی کبھی مذہبی عصبیتوں اور ان کے محارب اور معرکوں کے باوجود مسلمانوں کی علم دوستی اور تہذیب وری کا سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہا۔ علم کا مشوق جیسا ان میں سکون و استحکام کے دور میں تھا ویسا ہی طوائف اللو کی اور سیاسی انتشار و اختراق کے دور میں بھی قائم رہا۔ دو بار کو چھوڑو جہاں رات دن زرو جو اہل علم کے قدموں پر نثار ہوتے تھے، بزم کو جانے دو جہاں علمی دلچسپیاں سوسائٹی کا عام مشغلہ تھیں، رزم کو جہاں ہر شخص شمشیر بخت ہے اور گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ جو ہاتھ تلوار پکڑے ہوئے ہیں انھوں نے کبھی قلم بھی چھوا ہوگا۔ لیکن اسلامی تاریخ کی ورق گردانی کرتے چلے جاؤ، جا بجا جہاں جدال و قتال کا نقشہ جما پاؤ گے وہاں سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایسی صورتیں نظر آئیں گی جو قلم کی بھی ویسی ہی دھنی ہیں جیسی تلوار کی۔

”ہر چند کہ علم کی سرپرستی حکومت اسلامی کا عام شیوہ تھا، لیکن مسلمانوں کی ترقی علم کا مدار محض دولت پر نہ تھا بلکہ زیادہ تر ان پرستاران علم کی ذاتی جدوجہد پر تھا جو بجز فضل و کمال اور علم و دانش کے کسی دوسری چیز کے سامنے اپنی پشت خم کرنا علم و فضل کی توہین تصور کرتے تھے۔ اسی بے نیازی اور استغنا کا نتیجہ تھا کہ حکومت و دولت کی گردن اکثر ان کے در پر جھکی رہتی تھی۔ علم کی عام قدر و منزلت اور وسیع اشاعت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خود مسلمان فرمانروا اپنے لئے تحصیل علم کو طرہ امتیاز تصور کرتے تھے۔ تاریخ بہت سے ایسے مسلمان تاجداروں کے نام گنوا سکتی ہے جنہیں علم و فضل کے ربار میں ممتاز جگہ ملے گی۔“

دسویں و گیارہویں صدی جو علمی ترقی کے اعتبار سے تاریخی اہمیت کی صدیاں ہیں،

ایسے فرمانرواؤں اور علما و فضلاء سے بھری پڑی ہے۔ اس کی تفصیل ایک دفتر چاہتی ہے جس کا یہاں موقع نہیں کیا علمی دنیا انجندی، ابوالوفاء، ابو نصر بن علی بن عراق، احمد بن عبد اللہ حبش، ابن مسکویہ، فارابی، الرازی، ابن سینا، الجریطی، الزرقانی اور ابن بابہ کے علمی کارناموں سے ناواقف ہے؟ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک درخشاں کڑی ابوریحان البیرونی کی عظیم شخصیت بھی ہے جس کے علمی کارناموں پر صدیوں پر وہ پڑا رہا لیکن اس دور میں جب علم و تحقیق کے شہدائیوں کو اُس کی بعض کتابوں کا سراغ ملا اور انہیں ان کے مشمولات کی خبر لگی، تو ان میں سے ہر عالم اور ہر محقق بکا راٹھا کہ وہ آسمان علم کا مہر منیر ہے اور دنیا کی علمی تاریخ میں معدودے چند افراد ہی اس کی ہمسری کے مستحق قرار پا سکتے ہیں محمد بن احمد ابوریحان کو شروع ہی سے بیرونی (البیرونی) کہا جاتا تھا، یا بعد میں وہ اس لقب سے مشہور ہوا، اس کے بارے میں تذکرہ اور تاریخ کی کتابیں خاموش ہیں اس کے مولد سے متعلق نئی تحقیقات نے اس نظریے کو مشتبہ کر دیا ہے کہ وہ خوارزم کے مضافات میں ایک قریے میں پیدا ہوا تھا اور چونکہ وہ خاص خوارزم کا نہ تھا اور اہل خوارزم اپنے شہر سے باہر کے رہنے والوں کو بیرونی کہتے تھے اس لئے اس کی نسبت بھی بیرونی ہوئی۔ ۱۹۷۹ء میں پاکستان میں البیرونی کی یاد میں جو کتاب چھپی ہے اس میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (اسلام آباد) کے پروفیسر شمسی کا بھی ایک مقالہ ہے۔ پروفیسر موصوف نے لکھا ہے کہ محمد بن تاو بیت الطنجہ کو البیرونی سے متعلق اپنی تحقیقات کے دوران خود البیرونی ایک بیان اس کی جائے و تاریخ پیدائش کے بارے میں اس کے رسالے مقالۃ فی حکایت اہل الہند فی استخراج العمر میں ملا اور اسے انہوں نے البیرونی کی کتاب تحدید نہایۃ الاماکن تصحیح مسافات المساکن کے اپنے نئے ایڈیشن میں نقل کیا ہے۔ اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس وقت کے خوارزم کے دار السلطنت (مدینۃ خوارزم) میں ۳۲۷ ہجری (۹۳۹ء) کو پیدا ہوا۔ خوارزم کا دار السلطنت اس وقت کاٹ تھا۔ پروفیسر شمسی نے کاوش سے تمام معلوم شواہد کو سامنے رکھتے ہوئے کاٹ ہی کو البیرونی کا مولد ثابت ہے۔ لیکن ان کے لئے بھی یہ مسئلہ سوال ہی بنا رہا کہ اُسے البیرونی یا بیرونی کیوں کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”حقیقت یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے۔ اب بہر حال ہمیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ اُسے

بیرونی کے نام سے اس لئے نہیں شہرت ملی کہ وہ بیرون نام کے کسی مقام پر پیدا ہوا یا یہ کہ وہ خاص شہر کاٹ سے باہر کسی جگہ پیدا ہوا تھا۔ اس بات پر یقین کرنے کے اسے

ہی ہیں کہ خوارزم کی سرزمین اس کا وطن تھی۔ پھر اُسے البیرونی کیوں کہا گیا؟ میرا خیال ہے کہ دو طرح سے اس سوال کا جواب دیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خوارزم کے پورے علاقے پر امیر کرو کا بیخ (جرمانیہ) کے قبضہ سے پہلے بھی اسے البیرونی کہا جاتا تھا، پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا خاندان خارج خوارزم سے تعلق رکھتا تھا۔۔۔ لیکن اگر یہ بعد کا اضافہ ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خارج خوارزم کے رہنے والے بھی اجنبیوں یا باہر سے آکر بسنے والوں کو البیرونی کہتے تھے اور چونکہ اُسے یہ پسند نہیں تھا کہ اسے الخوارزمی کہا جائے اس نے البیرونی کی نسبت ہی کو اپنے لئے منتخب کیا۔ (صفحات ۲۶۷، ۲۶۸)

البیرونی کے خاندان سے متعلق ہماری معلومات ناقص ہیں اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کا بچپن کس طرح گذرا اور اس نے تحصیل علم کے لئے کن کن فضلاء کے روزگار کے سامنے رانوائے تلمذ کیے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ عجمی تھا اور آثار باقیہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اُسے اپنے عجمی ہونے پر فخر بھی تھا۔ جو علوم اس نے سیکھے اور جس زبان میں اظہار خیال کے لئے اس نے کامل دستگاہ حاصل کی وہ علوم اور وہ زبان اس عرب تمدن کا۔ ولانینک تھے جو عہد بنی عباس کے آغاز ہی میں تمام اسلامی علاقوں کا تمدن قرار پانے لگا تھا۔ اس تمدن کا مدار عربی زبان پر تھا اور اس کی علمی زبان عربی تھی اور عربی زبان و ادب میں البیرونی کو بھارت تامہ حاصل تھی۔ یاقوت نے معجم الادباء میں اسی حیثیت سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

” وہ ایک بڑا ادیب اور لغوی تھا اور ابن رعلوم، میں اس کی تصانیف

بھی ہیں جن کو میں نے دیکھا ہے، ایک تو اب تمام کے اشعار کی شرح ہے جس کا نسخہ میں نے خود اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ہے لیکن وہ نامکمل رہا۔ دوسری کتاب کا نام التعلیل باحالیۃ الوہم فی معانی نظم اونی الفضل ہے، ایک کتاب میں اس نے سلطان محمود کے زمانے کی تاریخ اور اس کے باپ کے حالات لکھے ہیں، خوارزم کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام کتاب المسامرہ ہے، ایک اور کتاب مختار الاشعار والاثار ہے، اور نجوم، ہیئت، منطق اور حکمت کے موضوعات پر اس نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ بے شمار ہیں۔ میں نے وقف جامع مرو میں ان کتابوں کی فہرست گنجان خط میں ساٹھ ورق میں دیکھی ہے۔“

۱۔ اس کتاب کے نام مسامیر خوارزم ہے، بیہقی کی تاریخ میں غلطی سے مشاہیر خوارزم چھپ گیا ہے (سید حسن برنی ص ۱۲)

۲۔ یاقوت معجم الادباء، بستر ہو میں جلد، وزارة المعارف العمومیہ، مدینہ منورہ ۱۳۵۵ھ

اسی موقع پر جبکہ البیرونی کی تصانیف کا ذکر آگیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مکتوب کا تذکرہ کر دیا جائے جو اس نے اپنے ایک دوست کو اپنی اور ابوبکر ابن زکریا الرازی کی تصانیف کے بیان میں لکھا تھا۔ یہ مکتوب ایک مستند اور نہایت اہم دستاویز ہے اور اس سے محققین کو البیرونی کی صحیح تاریخ ولادت متعین کرنے میں مدد ملی ہے۔ یہ مکتوب اس نے ۴۲ ہجری میں لکھا تھا اور کہا تھا کہ اس وقت میری عمر ۶۵ سال قمری اور ۶۳ سال شمسی ہے۔ اس مکتوب میں البیرونی کی نہرست کتب کے سلسلے میں شہر زوری کا یہ بیان جس کی تائید معجم الادباء سے بھی ہوتی ہے، خاص اہمیت رکھتا ہے:

”بیرونی ہمیشہ علوم کے حاصل کرنے میں محو رہتا تھا اور کتابوں کی تصنیف پر جھکا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ سے قلم کو دیکھنے سے آنکھ کو اور غور و فکر سے دل کو کبھی جدا نہ کرتا تھا، مگر سال میں صرف دو روز یعنی نوروز اور مہرجان کے دن جب وہ اپنے کھانے وغیرہ کا سامان مہیا کرتا تھا یہ۔“

البیرونی کا یہ مکتوب لیڈن میں (مخطوط نمبر ۱۳۲) محفوظ ہے اور اسے ۱۹۳۶ء میں پہلی بار پال کراؤس نے پیرس میں چھاپا تھا، لیکن اس سے پہلے یہ مکتوب جو رسالت الفہرست کے نام سے مشہور ہوا اور جس کی شرح ابواسحق ابراہیم بن محمد بن الغضنفر تبریزی (م ۱۲۹۲ء) نے المشاطہ رسالت الفہرست کے عنوان سے لکھی تھی، ایڈورڈ واٹمن اور جے۔ روسکا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا چکا تھا۔ اس میں اس نے رازی کی ایک سوچو راسی اور اپنی ایک سو تیرہ کتابوں کے نام لکھے تھے، ایک سو تیرہ میں اس کی وہ کتابیں بھی شامل تھیں جو اس وقت نامکمل تھیں۔ ان کتابوں سے اس کے ہمہ گیر مذاق حکمت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی کہ حقائق کی تلاش و جستجو میں اس کی محویت اور فراوانی شوق کا کیا عالم تھا۔ اس کی بھرپور شہادت وہ ایک واقعہ ہے جس کا تذکرہ اس نے اپنے اس مکتوب میں کیا ہے اور جسے بقول سید حسن برنی اس نے اس طرح لکھا ہے:

”میں نے ابوبکر بن زکریا الرازی کی اس کتاب کا جو علم الہی کے متعلق ہے مطالعہ کیا۔ اس میں اس نے مانی کی کتابوں کی طرف رہنمائی کی ہے۔ بالخصوص اس کتاب کی طرف جس کا نام سفر الاسرار ہے۔ مجھے اس کتاب کے نام سے ایسی فریفتگی ہوئی جیسے اور لوگوں کو کیمیا کے متعلق سونے چاندی کی فریفتگی ہوتی ہے۔ میری نو عمری بلکہ حقیقت کی پردہ پوشی نے دل میں اس کتاب کی



طلب کی کمال خواہش پیدا کی کہ کسی شہر یا ملک میں جہاں اپنا آشنا سا ہو اُسے تلاش کیا جائے۔ میں چالیس برس سے کچھ زیادہ اسی تپش کی جیتا بیوں میں رہا یہاں تک کہ جند ہمدان سے ایک شخص آیا جس نے فضل ابن سہلان کے ذریعہ سے کچھ کتابیں پائی تھیں اور اسے معلوم ہوا تھا کہ مجھے ان کا بہت اشتیاق تھا۔ شخص مذکور نے ان کتابوں کو مجھ سے ملاقات حاصل کرنے کا وسیلہ بنایا۔ اس کے پاس ایک مجموعہ تھا جس میں مانی کی حسب ذیل کتابیں تھیں: فرما طیہ، سفر الجوابرہ، کنز الایجاد، نصح الیقین، تاسیس، انجیل اور شاہ بورقان اور مانی کے چند دوسرے رسالے تھے اور میری مطلوبہ کتاب سفر الاسرار بھی ان میں شامل تھی۔ مجھے اس قدر خوشی ہوئی جیسے پیاسے کو شربت کے دیکھنے سے ہوتی ہے، لیکن اخیر میں ایسا ملال ہوا جیسے ناگوار چیز کھانے سے ناگوار لڑکار آتی ہے۔ میں نے خدا کو اپنے قول میں سچا پایا کہ جس کو خدا روشنی نہیں دیتا اس میں روشنی نہیں

ہوتی! پھر میں نے اس کتاب میں سے لغو اور بیہودہ باتوں کو باختصار ایک جگہ جمع کر دیا تاکہ جو شخص میری طرح گرفتار مصیبت ہو اسے بڑھ کر جلد شفا حاصل کر لے جیسا کہ میرا حال ہوا۔

البیرونی نے اپنے عہد کے تقریباً تمام متداول علوم میں کامل دسترس بہم پہنچائی تھی۔ مبد فیض سے اُسے غیر معمولی حافظہ اور ایک خلاق ذہن ملا تھا، اس میں وقت نظر کے ساتھ وہ علمی نظر بھی تھی جو تجزیاتی اور استقرائی طرز استدلال کی جان ہوتی ہے۔ اُس کا مطالعہ بھی گہرا اور وسیع تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے بہت جلد، جہاں تک کہ ریاضی ہیئت، نجوم اور حکمت کا تعلق ہے، اپنے ہمعصر عالموں میں امتیاز حاصل کر لیا۔ اس کی مشہور کتاب الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ جس میں گزشتہ زمانوں کے علمی آثار وغیرہ سے بحث کی گئی ہے، اس کی کم عمری کے زمانے کی تصنیف ہے۔ لہٰذا اس کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس سے پہلے وہ مختلف علوم میں متعدد کتابیں لکھ چکا تھا جن میں وہ خط و کتابت بھی ہے جو البیرونی اور ابن سینا کے مابین ہوئی تھی اور جسے اُس نے ایک رسالے کی شکل میں درون کر لیا تھا۔ ابن سینا ارسطو کا مقلد تھا، البیرونی نے شاگرد سے گذر کر طبیعات

۱۔ سید حسن برنی، البیرونی، صفحات ۲۱۵-۲۱۴، الآثار الباقیہ کی تصنیف کا زمانہ ۱۰۰۰-۹۹۹ء ہے۔ اس وقت مصنف کی عمر تقریباً ۲۷ سال تھی۔

سے متعلق خود ارسطو کے بعض مفروضات پر اعتراضات کئے تھے جن سے اس کے تازہ کار فکر کی بلند پروازی پر روشنی پڑتی ہے۔

انبیر زنی کی ولادت آل عراق کے حکمراں احمد بن محمد کے عہد سلطنت میں ہوئی۔ اس کا گھرانہ کوئی امیر گھرانہ تھا اور حسب نسب کے اعتبار سے بھی سربراہ اور وہ نہ تھا۔ اسے جو شہرت ملی وہ محض اس کے فضل و کمال کی بنا پر ملی۔ اس سے ہمیں مسلم معاشرہ میں نظریہ مساوات کی کار فرمائی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ علم و فن کی دنیا بھی کسی مخصوص طبقہ کی میراث نہ تھی۔ ایک معمولی شخص پر بھی علم و فن کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور کوئی بھی خواہ امیر ہو یا غریب اپنے شوق اور اپنی صلاحیت کے مطابق اس خرمین سے خوشہ چینی کر سکتا تھا۔ البیرونی کی زندگی کے حالات ہمیں تفصیل سے نہیں معلوم اور نہ یہ معلوم ہے کہ آل عراق نے اس کی کس طرح پذیرائی اور قدر دانی کی۔ بس، ایک اُس قصیدے سے جو اُس نے سلطان غزنویں کے کاتب ابو الفتح بسٹی کی مدح میں لکھا تھا، یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ آل عراق کا اور خاص طور پر ابو نصر بن منصور علی بن عراق مولی امیر المومنین کا بہت زیادہ مرہون منت تھا، اسی قصیدے میں اس نے سلطان محمود کے احسانات کا بھی ذکر کیا ہے، اگرچہ سلطان محمود سے اس کے تعلقات پر کچھ مدلل اور کچھ مشتبہ قیاس آرائیوں کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس قصیدے کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں:

مَضَى أَكْثَرُ أَيَّامِ نِيْ ظِلِّ نِعْمَةٍ	عَلَى رُتْبٍ فِيهَا غُلُوتٌ كَمَا مَيَّيَا
فَأَلِ عِرَاقٍ تَدْعُوْنِيْ بِدَرِّهِمْ	وَمَنْصُورٍ مِنْهُمْ قَدْ تَوَلَّى عَمْرًا أَيْيَا
وَسَمْسُ الْمَعَالِي كَانَتْ يَوْمًا وَجِدْتِي	عَلَى نَفْرَةٍ مَيِّتٍ وَقَدْ كَانَتْ قَابِيَا
وَأَوْلَادُ نَاهُونَ وَمِنْهُمْ عَلَيْهِمْ	تَبَدَّى بِصَنْعِ صَارَ لِلْجَالِ أَيْيَا
وَأَخْرَجَهُمْ نَامُونَ رَقَّةً حَالَتِي	وَتَوَلَّى بَأْسِي ثُمَّ زَأَسَ رَابِيَا
وَلَمْ يَنْقَبِضْ مُحْمُودٌ عَنِّي بِنِعْمَةٍ	فَأَغْنِي وَأَغْنِي مُغْضِيًا عَن مَكَايَا
عَفَا عَن جَهَالَاتِي وَأَبْدَى تَكْرَمًا	وَطَرِّي بِجَاهِ دُونِيْ وَلِبَا سِيَا
عَفَا عَلَى دُنْيَايَ بَعْدَ فِرَاقِهِمْ	وَوَاخِرَتِي إِنْ لَمْ أَرُدْ قَبْلُ أَيْيَا
وَلَمَّا مَضُوا وَأُعْتَضْتُ مِنْهُمْ عَصَاةً	دَعَا بَا النَّاسِي نَاغَلَمْتُ النَّاسِيَا
وَخَلَفْتُ نِيْ غَزْنِيْنَ لِحَمَا كَمُضْعَةٍ	عَلَى وَضْعِ اللَّطِيْرِ لِلْعِلْمِ نَابِيَا
فَأَبْدَلْتُ أَوْامًا وَلَيْسُوا كَمَثَلِهِمْ	مَعَاذَ إِلَهِي أَنْ يَكُونُوا سَوَابِيَا

بِجَهْدٍ شَأْوَتِ الْجَالِيَيْنِ أُمَّةً  
فَمَا بَرَكُوا لَلْبَحْتِ عِنْدَ مَعَالِمِ  
فَسَائِلِ بِمَقْدَارِ هُنُودًا بِمَشْرِقِ  
فَلَمْ يَتَّبِعْهُمْ عَن تَسْكُرٍ جُهْدِي نَفَاسَةً  
فَمَا أَتَبَسُّوا فِي الْعِلْمِ مِثْلَ أَتْبَاسِيَا  
وَلَا أُحْتَبَسُوا فِي عُقْدَةِ كَا حُبَّاسِيَا  
وَبِالْفَرَابِ مَنْ قَدَّ قَاسَ قَدَّرَ سَمَايَا  
بَلِ اعْتَرَفُوا طَرَاوَعَا فَوَا انْتَبَاسِيَا

شعار کا مفہوم یہ ہے:

اکثر زمانہ نعمت کے سایے میں گذرا اور میرا رتبہ بلند رہا۔ آل عراق نے میری سرپرستی کی خصوصاً منصور نے میری بنیادیں جمائیں۔ شمس المعالی (قابوس بن وشمگیر) میری صحبت کا متمنی رہتا تھا، اگرچہ میں اس کی سخت گیر یوں سے متنفر تھا، اور آل مامون میں ایک علی تھا جو میرا غمخوار رہا، اس خاندان کے آخری وزیر و مامون نے مجھے خوشحال بنا دیا، مجھے شہرت دی اور مجھے سر بلند کیا، (سلطان محمود نے مجھے کسی نعمت کے بخشنے میں کبھی کوئی دریغ روا نہ رکھا، مجھے کافی دیا اور میری سخت طلبی سے چشم پوشی کی۔ میری حماقتوں سے درگزر کیا، میری عزت افزائی کی اور اس کے جاہ و مرتبت سے میرے دن پھر گئے۔ یہ لوگ نہ ہے تو میری دنیا تاریک ہو گئی جس طرح پرندوں کے لئے گوشت کا ایک ٹوٹھرا چھوڑ دیا جاتا ہے اسی طرح اب میں غزنیوں میں علم کو بھلا دیتے والوں کے لئے چھوڑ دیا گیا ہوں۔ میں نے حصول علم میں بڑی جدوجہد کی اور وقت کے اماموں سے آگے بڑھ گیا۔ میری قدر مشرق میں ہندوؤں سے پوچھو اور مغرب میں اُس شخص سے جسے میری علمی کاوشوں کا اندازہ ہے۔ (مجھے یقین ہے) کہ وہ اس کا اعتراف کریں گے،

خوارزم میں آل عراق کی حکومت ۹۹۵ء تک رہی اور اس کے بعد البیرونی کے چند سال پریشاں حالی میں گذرے۔ تفصیلات کا تو علم نہیں لیکن آثار باقیہ میں اس کے اس کے کچھ عرصہ تک قیام کا تذکرہ ہے، یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ والی جرجان شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کے دربار میں کیسے پہنچا، لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ قابوس کے ادبی فضائل اور علمی کمالات شعراء و ادباء کے تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ لیکن وہ ایک جاہل اور سخت دل حکمراں تھا اور جیسا کہ اُس نے مذکورہ بالا قصیدہ میں لکھا ہے، البیرونی کو اس سے کبھی کوئی تعلق خاطر نہیں پیدا ہوا، پھر بھی وہ وہاں کئی سال مقیم رہا۔ اس زمانے میں بھی وہ علم و فن کی خدمت کی طرف سے غافل نہ تھا۔

آثار باقیہ اس نے یہیں لکھی۔ اس کے علاوہ اور بھی کچھ رسائل قلمبند کیے۔

جر جان سے وہ علی بن مامون کی دعوت پر اپنے وطن لوٹا اور پھر سلطان محمود کی فتح خوارزم (۶۱۰ھ) تک وہ وہیں رہا۔ علی بن مامون کی دوستی اور اس کے وزیر السہیلی الخوارزمی کی ہنر پروری ابن سینا کو بھی بخارا سے خوارزم کھینچ لائی تھی۔ علی کے بعد اس کا بھائی ابوالعباس مامون بادشاہ ہوا جس کے دربار کی علمی آب و تاب قابل رشک تھی اور خوارزم شاہیوں کی علم دوستی کی روایت کو زندہ کئے ہوئے تھی۔ لیکن اس عہد میں وسط ایشیا کے سیاسی حالات نہایت اترتھے اور سلطان محمود کی بڑھتی ہوئی طاقت سبھی امراء و سلاطین کے سر پر ہمہ وقت تلوار بن کر لگتی رہتی تھی، آخر کار وہ وقت آ پہونچا جب خوارزم میں آل مامون کا ستارہ گردش میں آیا، محمود نے خوارزم پر لشکر کشی کی اور اسے فتح کر لیا۔ البیرونی ابوالعباس کا معتمد علیہ اور سلطنت خوارزم کا مشیر تھا۔ کیسا حسن اتفاق تھا کہ وہ محمود کے جذبہ انتقام سے محفوظ رہا اور محمود کے ساتھ دیگر اعیان و مشاہیر خوارزم کے ہمراہ غزنین پہونچا، ابن سینا محمود کی فتح سے پہلے ہی خوارزم کو خیر باد کہہ چکا تھا۔ اس طرح وہ علمی مجلس جو خوارزم کے دربار شاہی کی امتیازی خصوصیت تھی، ہمیشہ کے لئے درہم برہم ہو گئی۔

دربار محمود سے البیرونی کی وابستگی سے متعلق طرح طرح کے واقعات مشہور اور کتابوں میں درج ہیں، ہم یہاں ان کا ذکر نہیں کرتے، البتہ اتنا ضرور کہیں گے کہ خوارزم میں جس قسم کا علمی ماحول تھا، البیرونی کو اس طرح کا ماحول غزنین میں نہیں ملا۔ علم و حکمت سے جو شغف آل عراق اور آل مامون کو تھا سلطان محمود پر اس طرح کے علمی شغف کا الزام ہم نہیں لگا سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جیسا کہ اُس زمانے کا چلن تھا کہ سلاطین و امراء اپنی بارگاہوں کو علماء و ادباء و شعراء سے مزین رکھتے تھے، محمود بھی یہ چاہتا تھا کہ اس کے دربار میں اہل علم اور ارباب فن کا مجمع رہے اور اس لحاظ سے کوئی اور دربار اس کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکے۔ پھر البیرونی علم نجوم کا ماہر تھا اور حکمرانوں کو اکثر اس فن کے ماہرین کی ضرورت رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ البیرونی نے اسی کو غنیمت جانا ہو اور اس منقنم صورت حال کو سکون و سلامتی کے ساتھ اپنی علمی تشنگی کے بجھانے کا ذریعہ سمجھا ہو۔ خوارزم میں روزگار و بارسلطنت میں بھی شریک رہتا تھا، اُس سلطنت کی تباہی اور سیاسی حال کی بے اعتباری سے غالباً وہ اس نتیجہ پر پہونچا ہو کہ وہ آئندہ سیاست و حکومت سے دور ہی رہے گا، اس لئے غزنین پہونچنے کے بعد ہم اُسے یکسر علمی تحقیقات میں منہمک پاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر میں آنے کے بندہ جو اس وقت ہندوستان کا دروازہ تھا،

اس کے دل میں ہندوستان اور اہل ہندوستان سے متعلق حقائق کی دریافت کا شدید شوق پیدا ہوا۔ غزنین میں بھی خود ہندوؤں کی آبادی تھی، ممکن ہے کہ انھیں دیکھ کر اس کے دل میں ہندوؤں سے متعلق مستند معلومات بہم پہنچانے کا ولولہ پیدا ہوا ہو۔ یہ بات بہر حال بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ البیرونی کی سیاحت ہند محمود کی تحریک اور دلچسپی سے ہوئی ہو۔ بریٹانیا اس کے ہندوستان میں اپنی نقل و حرکت، قیام اور علوم ہند کی تحصیل کے سلسلے میں اس نے جن مشکلات کی طرف اشارے کئے ہیں، ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس راہ میں محض اس کا شوق ہی رہا تھا اور اس کی متجسس طبیعت ہی اس کی یار و مددگار تھی۔ ہندوؤں کے علوم سیکھنے اور ان کی کتابیں حاصل کرنے میں جو رکاوٹیں حائل تھیں ان کا ذکر کرنے کے بعد اس نے کتاب الہند میں لکھا:

”ہے ظاہری حال۔ ان کی کتابیں جمع کرنے کی حرص میں، جہاں سے بھی ان کے ملنے کی امید ہو سکتی تھی، اور اس کے لئے بقدر امکان بے دریغ خرچ کرنے میں، میرے زمانے میں دوسرا کوئی میرا مقابل نہیں تھا اور ایسے لوگ بھی مل گئے تھے جو گناہ اور مخفی مقامات سے ان کا پتہ لگائیں، پھر بھی اندرونی موانع نے ہم کو اس میں عاجز رکھا، اور میرے سوا دوسرے کو بھی اس قسم کے موانع پیش آئیں گے مگر یہ کہ اللہ اپنی مدد سے کسی کو ان حرکات پر قدرت دے جن سے میں محروم تھا یعنی ایسا موقع مہیا کر دے کہ وہ بے روک ٹوک جہاں چاہے آجا سکے، اور امر وہی کے کرنے نہ کرنے میں بے بس تھا اور ان کی راہیں مجھ پر بند تھیں، اور جتنا بھی ہو گیا اس پر اللہ کا شکر ہے“

البیرونی اور محمود کے مزاج میں بڑا تفاوت تھا، پھر خواجہ احمد بن حسن میمند کا بھی جو محمود کا وزیر تھا، غالباً البیرونی سے خوش نہ تھا، بہر حال وجہ کچھ بھی رہی ہو، محمود کے زمانے میں دربار غزنین میں اُسے وہ سازگار فضا میسر نہ تھی جس کا لطف وہ مامونیوں اور قابوس کے دربار میں اٹھا چکا تھا، پھر بھی یہ اس کا کمال اور اس کے علمی شوق کی انتہا ہے کہ کوئی بارہ تیرہ برس اُس نے اہل ہند کے علوم کے سیکھنے اور ان کی تہذیب و ثقافت کے سمجھنے میں صرف کئے۔ اس عرصہ میں وہ کئی بار ہندوستان آیا اور غزنین واپس گیا، کئی کتابیں اور مقالے لکھے، سنسکرت زبان میں مہارت حاصل کی اور سنسکرت کی بعض کتابوں کے عربی ترجمے کئے اور یہ سب کام اُس نے ایسے حالات میں کئے کہ وہ اپنے

احوال سے مطمئن نہ تھا، اُدھر مغربی ہندوستان میں محمود کے حملوں سے ہر طرف کھلبلی مچی ہوئی تھی، اہل ہند کے دلوں میں حملہ آوروں اور اُن کے ہم مذہبوں کے خلاف معاندانہ جذبات متلاطم تھے۔ ایک طرف فوج کشیاں ہیں، تلواریں سونتی جا رہی ہیں، نیزے تیز کئے جا رہے ہیں اور ترکشوں میں تیر بھرے جا رہے ہیں، دوسری طرف یہ ہے کہ ایک مسلمان عالم خاموشی کے ساتھ اس دُھن میں ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ علمی رابطہ قائم کیا جائے، علمی دیانتداری کے ساتھ ان کے علوم کو سیکھا اور ان کی تہذیب کو سمجھا جائے اور اپنے ہم مذہبوں اور تمدن و ثقافت کے طالب علموں اور عالموں کے لئے ایسی یادگار چھوڑ جائے جو دو ایسی قوموں کے مابین افہام و تفہیم کا وسیلہ بنے جن کا عقائد و اعمال میں بعض بنیادی اختلافات کے باوجود، ساتھ ساتھ رہنا مقدر بن چکا تھا۔ صد آفریں ہے ابوریحان البیرونی کو جس نے ایسے پُر آشوب زمانے میں وہ کار نمایاں انجام دیا جسکی نظیر دنیا کی علمی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔

۱۰۳۰ء میں سلطان محمود کا انتقال ہو گیا، اس کے بعد محمود کے بیٹوں محمد اور مسعود میں خانہ جنگی شروع ہوئی جس کے ختم ہونے میں کوئی ایک سال کا عرصہ لگا۔ سیاسی انتشار کے اس دور میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ البیرونی عزت نشیں ہو کر کتاب البہد کی تصنیف میں مصروف رہا۔ مسعود کو اپنے بھائی پر فتح تو حاصل ہو گئی تھی لیکن وہ اس سلطنت کو باقی رکھنے میں جسے قائم کرنے میں محمود نے اپنی عمر عزیز اور ساری صلاحیتیں صرف کر دی تھیں کامیاب نہ ہو سکا اور آخر میں اس کے پاس بجز ہندوستان کے اور کچھ نہ بچا۔ سیاسی اور فوجی اعتبار سے مسعود ایک ناکام حکمران تھا، لیکن علمی لحاظ سے اُس کا مرتبہ بلند تھا۔ وہ دہلیم نجوم کا شائق اور حقائق علمیہ کا دلدادہ تھا، ادیب تھا اور زبانِ عربی سے خوب واقف تھا۔ اسی کی خواہش پر البیرونی نے لوازم الحکمتین نامی کتاب لکھی اور القانون المسعودی تو ایسی کتاب ہے جو تنجیم و حساب میں اپنی نظیر آپ ہے۔ مسعود کے بعد محمد کو بادشاہ بنایا گیا لیکن جلد ہی مسعود کے بیٹے مودود نے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے لیا اور غزنیں کے تخت پر متمکن ہوا۔ مودود آخری بادشاہ تھا جس سے البیرونی کا سابقہ پڑا۔ اس نے مودود کے لئے جواہرات پر اپنا مشہور رسالہ الجواہر فی معرفت الجواہر قلمبند کیا اور اور بہترین محاسن کے موضوع پر الدستور لکھی اور اس کے نام سے معنون کی گئی۔ اوپر گزر چکا ہے کہ جب البیرونی نے ایک دوست کی فرمائش پر زکریا الرازی کی

کتابوں کی فہرست تیار کی تھی تو اس وقت اس کی عمر ۶۳ برس کی تھی، اپنے دوست کو اُس نے جو خط لکھا تھا وہ ۱۰۳۸ء میں لکھا تھا، اس سے پہلے غالباً ۱۰۳۵ء میں اس کی گرتی ہوئی صحت کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وہ سخت بیمار پڑا تھا، اس مکتوب میں اس نے اپنی اس علالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ جب میری عمر ساٹھ (۶۶) سے کچھ کم ہی تھی تو مہلک بیماریوں نے چاروں طرف سے آدبا یا بعض ایک ہی وقت میں پیدا ہوئیں اور بعض یکے بعد دیگرے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھوں نے ہڈیوں کو پارہ پارہ، بدن کو چور چور، حرکت تک سے معذور اور حواس باختہ کر دیا۔ باوجود اس کے کہ بڑھاپے سے قوی ماؤف ہو چکے تھے، میں نے طبیعت کو درست کرنے کی کوشش کی۔

غالباً اسی بیماری میں یا صحتیابی کے فوراً بعد البیرونی نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر اُس نے یہ کی تھی کہ ابھی وہ کئی برس زندہ رہے گا لیکن اس سلسلے میں اس کے جو کچھ مذکورہ بالا مکتوب میں لکھا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود البیرونی کو اس کا احساس ہو گیا تھا کہ اب زندگی کی شام آگئی ہے اور آفتاب زلیست جلد ہی غروب ہو جائے گا۔ اُسے اپنی زندگی کے رائیگاں جانے کا افسوس نہ تھا کہ اس نے ایک مشغول علمی زندگی گزاری تھی، اُسے شاید اس کا بھی غم نہ تھا کہ ساری عمر سجد میں گزری اور اس کے کوئی اولاد نہ تھی کہ عصائے پیری بنتی کیونکہ اس نے اپنی کتابوں کو جنہیں اس نے آغاز عمر میں تصنیف کیا تھا کبھی کمتر نہ جانا اس لئے کہ وہ سب میرے فرزند تھے اور اکثر لوگ اپنے کلام اور فرزند پر فریفتہ ہوتے ہیں، مکتوب محولہ بالا، البیرونی نے اپنے خواب کی تعبیر کے ذکر کے بعد لکھا تھا۔

۱۔ باوجود اس کے مجھے کچھ خوشی نہ ہوئی، اس لئے کہ عمر بسر ہو چکی تھی اور اس میں صرف ایک کام کرنے کے لئے تھوڑا سا حصہ رہ گیا تھا۔ وہ کام ان کتابوں کا مکمل کرنا ہے جو ناقص حالت میں موجود ہیں اور ان مسودوں کو صاف کرنا جو ابھی تک نا صاف پڑے ہیں، مثلاً، قانون مسعودی وغیرہ اور ان کتب ہند کو حوالہ قلم کرنا جن کا ترجمہ کرنا پیش نظر ہے۔ اس کے لئے خدا کی مدد، فکر کو منتشر کرنے والی چیزوں سے امن اور رازی عمر تا آخر اجل کی سلامتی حواس اور عمر کے موافق صحت بدن کے سوا کوئی چیز مقصود نہیں ہے۔

البیرونی کے ان جملوں سے، باوجود پیرانہ سالی کے، صاف نمایاں ہے کہ اسکی

ہمت مردانہ اور انہماک علمی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے، بس وہ اتنی مہلت چاہتا ہے کہ اس کے ادھورے کام پورے ہو جائیں اور جب آخری وقت آجائے تو اسے اطمینان رہے کہ اُس نے اپنی تمام اولاد (تصانیف) کو نوک پلک سے آراستہ کر دیا ہے۔ آخر وقت موعود آ پہنچا اور ہمارے اس شیفتہ علم و فن اور فرد فرید نے ۱۹۲۲ء (قریب ۱۰۵۱ھ) میں پیام اجل کو لبیک کہا اور اس طرح اس کی عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ گیا۔

یا قوت نے وقت جامع مرو میں البیرونی کی کتابوں کی فہرست گنجان خط میں ساٹھ ورق میں دیکھی تھی، اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس کی تصنیفات کا دفتر بے پایاں تھا، لیکن اس میں سے نہ معلوم کتنی کتابیں ناپید ہو گئیں جن کے نام سے بھی ہم ناواقف ہیں۔ اپنے دوست کو اس نے جو مکتوب لکھا تھا اس میں اپنی ایک سو تیرہ کتابوں کی فہرست دی تھی اس کے بعد قمری حساب سے وہ تقریباً ۱۶ برس زندہ رہا اور اس مدت میں یقیناً اس نے کچھ اور کتابیں لکھیں جن میں سے بعض کے نام اب ہمیں معلوم بھی ہو گئے ہیں۔ اس کی تمام تصنیفات اگر دستیاب ہوتیں تو پتہ لگ سکتا تھا کہ اس نے کتنے علوم کو اپنی فکر و نظر اور اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور ان علوم کی ترقی و اضافہ میں اس کا کیا حصہ تھا۔ میں تو اس کا اہل نہیں کہ اس پر کچھ روشنی ڈال سکوں، لیکن آئندہ ممکن ہے کہ کوئی محقق اور عالم اس سلسلے میں کچھ کہہ سکے۔

البیرونی کی جو کتابیں میری نظر سے گزری ہیں یا اس کی بعض کتابوں کے جو ترجمے میں نے دیکھے ہیں ان کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ قدرت نے اُسے علوم قطعہ میں تحقیق و تدقیق ہی کے لئے پیدا کیا تھا۔ ریاضی اور ریاضیاتی علوم کے میدان میں اس کی فکری و تجربی کاوشیں بے پناہ ہیں۔ ہیئت، علم پیمائش ارض (جیوڈیسی)، علم معدنیات، نباتات، علم الانسان، غرض کوئی شعبہ علم ایسا نہیں جس سے اُسے دلچسپی نہ رہی ہو اور جس سے متعلق اس نے کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو۔ اس کی فلسفیانہ بصیرت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بصیرت کو جلا ملی تھی مذہب سے، اور اسی کے سہارے اُس نے چند اہم مسائل پر غور و فکر کیا تھا۔ ریاضیاتی علوم کا وجدانی اور استخراجی طرز تحقیق اوزیعی اور نیچرل سائنس کا تجربی اور استقرائی طرز استدلال ہمیں البیرونی کی تحقیقات اور

۱ البیرونی نے کتاب الصیدۃ ۲۳۲ میں کمل کی اس لئے جیسا کہ الغضنفر تبریزی نے لکھا ہے، البیرونی کا

سن وفات ۱۰۵۰ھ نہیں ہو سکتا۔



نگارشات میں موضوع کے اعتبار سے جہاں جس کی ضرورت ہوئی، برابر ملتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ زمانہ حال میں جدید اصول تحقیق کو برتنے والے عالم البیرونی کو اپنے آپ سے بہت قریب پاتے ہیں۔

ایک اور اہم بات جس کی طرف لوگوں کی نظر کم جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ البیرونی کا نقطہ نظر اس مسئلہ کے بارے میں کہ زمین متحرک ہے یا سورج، عالمانہ اور حکیمانہ تھا۔ ایک متبر عالم علمی معاملوں میں اپنی رائے میں محتاط ہوتا ہے، جو بات ثابت نہیں ہو سکتی وہ نہ تو اس کا اقرار کرتا ہے اور نہ انکار۔ یہی رویہ البیرونی کا اس مسئلہ سے متعلق تھا کہ زمین متحرک ہے یا سورج۔ کتاب الہند میں بھی اُس نے اس کا ذکر کیا ہے اور استیعاب میں بھی جہاں اس نے اصطراب زورقی کے متعلق لکھا ہے۔ استیعاب میں وہ لکھتا ہے:

”ابوسعید سنجری نے ایک بڑا اصطراب بنایا تھا جس کا عمل مجھ کو بہت پسند آیا اور میں نے ابوسعید کی بہت تعریف کی، کیونکہ جن اصولوں پر اس نے اس کو قرار دیا تھا وہ کرہ ارض کو متحرک تسلیم کرتے ہیں۔ میں اپنی جان کی قسم کھاتا ہوں کہ یہ عقیدہ ایسی مشبہ کی حالت میں ہے کہ اس کا حل کرنا نہایت دشوار اور اس کا رد کرنا نہایت مشکل ہے۔ مہندسین اور علمائے ہیئت اس عقیدہ کے رد میں بہت پریشان ہوں گے۔“

اگر اہل یورپ حرکت زمینی سے متعلق البیرونی کے خیالات سے واقف ہوتے تو شاید وہ بطلیموس کے موقف کو حریف آخرت تصور کرتے اور کوپرنیکس سے بہت پہلے یہ ثابت ہو جاتا کہ آسمان نہیں بلکہ زمین متحرک ہے۔ ایک فلسفی کے طرز فکر پر غور و فکر کر کے اُس نے اس مسئلہ سے متعلق شک کا دروازہ کھول دیا تھا اور اُس عقیدہ کی بنیاد کھوکھلی کر دی تھی جس پر صدیوں سے ماہرین علم ہیئت کا ایمان تھا۔

البیرونی نہ تو مسلم فلاسفہ کے طرز کا فلسفی تھا اور نہ متکلمین کے طرز کا، پھر بھی ہم اُسے فلسفی کہہ سکتے ہیں کیونکہ کائنات کے وجود اور مابعد الطبعی امور پر اُس نے فلسفیانہ

۱۔ کتاب الہند، جلد اول، صفحات ۲۷۲-۲۷۱

۲۔ کتاب کا پورا نام کتاب فی استیعاب الوجود المکنہ فی صنعة الاصطراب ہے۔

۳۔ سید حسن برنی، البیرونی، صفحات ۲۱۱-۲۱۰، بحوالہ حالات ابوریحان بیرونی از مولوی عنایت اللہ

بی، اے، علیگ

بٹھیں کی ہیں، ابن سینا سے اس کا جو سوال و جواب ہوا تھا اس سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ وہ مشائی فلسفے کی روایت کا قائل نہ تھا، عالم کو قدیم نہیں مانتا تھا اور جزو لایعجزی کے نظریے کے ماننے والوں پر ارسطو کا جو اعتراض تھا اُسے غلط تصور کرتا تھا۔ ارسطو پر اُس کا یہ اعتراض بھی تھا کہ آخر وہ کس دلیل سے اُس عالم کے وجود سے انکار کرتا ہے جو اس عالم سے جدا ہے جبکہ اُس عالم کے امکان کی بہت سی دلیلیں ہیں اور اس کے خلاف جو دلیلیں ہیں انہیں رد کیا جاسکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کے وجود کی دلیلیں اس کے عدم کی دلیلوں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ تاریخ، جغرافیہ اور مہیت پر ابیرونی کی جو تصنیفات ہیں ان میں بھی سائنسی اور تاریخی مباحث کے ساتھ فلسفہ، علم کائنات اور مابعد الطبیعیہ پر اس کے خیالات مل جاتے ہیں۔ کتاب الہند میں جہاں اس نے ہندوؤں کے عقائد و افکار بیان کئے ہیں، وہیں اکثر ہمیں ان عقائد و افکار پر تبصرہ کے ساتھ اُس کے اپنے مابعد الطبیعی اور فلسفیانہ تصورات اور تشریحات بھی ملتی ہیں۔ آثار باقیہ میں زمانہ تاریخ انسانی کے ادوار اور قوانین قدرت میں یک رنگی اور استحکام سے متعلق اس کی جو بحثیں ہیں ان سے اس کی ژرف نگاہی اور علمی تعمق کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے، اسی کے ساتھ ”جہاں وہ قوانین قدرت کی منصوبی کا پورے طور پر معتقد ہے وہاں غایت فطرت کی رنگارنگ کیفیتوں اور پیچیدہ و لاینحل حالتوں کا خیال بھی اس کے دماغ میں موجود رہتا ہے اور وہ بخوبی جانتا ہے کہ موجودات میں بسا اوقات ایسی طبعی کیفیات ظہور پذیر ہوتی ہیں جو باری النظر میں ممکنات سے خارج معلوم ہوتی ہیں اور جن کے اسباب و علل کے معلوم کرنے سے اکثر انسانی عقل عاجز رہ جاتی ہے“ اسی ایک بات سے کہ ابیرونی نے سنسکرت کی دو کتابیں، سانگ اور پانچلی کا عربی زبان میں ترجمہ کیا، مابعد الطبیعی اور روحی مسائل سے اسکی گہری دلچسپی ظاہر و باہر ہے۔ سانگ کا موضوع محسوس اور معقول موجودات ہیں اور پانچلی میں جسم کی قید سے روح کے نجات پانے کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔

ابیرونی مسلمان تھا اور اُس کی بعض تصنیفات میں قرآنی آیات بطور شاہد اور دلیل قطعی کے مباحث متعلقہ کے ساتھ اس طرح پرودی گئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات انہیں موقعوں کے لئے نازل کی گئی تھیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کا قرآن اور دیگر علوم نقلی کا مطالعہ گہرا تھا اور قرآن نہی میں بھی وہ کسی کم نہ تھا۔ خدا، رسول اور آخرت پر اس کا ایمان محکم تھا۔ قانون مسعودی کے دیباچہ کے بعض برجستہ فقرے صاف پتہ دیتے ہیں کہ وہ محض عبارت آرائی کے لئے نہیں

ہیں بلکہ ایک سچے مسلمان کے قلب کی گہرائیوں سے نکلی درد و سوز میں ڈوبی آواز ہے۔ وہ لکھتا ہے:

”نیک سخت ہے وہ جو خدا کی توفیق سے نیک ہوا اور اس کے کرم سے اپنے ہم جنسوں و ہم عمروں میں یکتا ہو گیا۔ جسے خدا نے ادنجا کیا اُسے کوئی پست کرنے والا نہیں ہے۔ آباد زمین کے مغرب و مشرق میں اسلام کیسے پہنچتا اور اس کی خبر دنیا کے دور دراز علاقوں میں کیونکر پہنچتی اگر اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور مومنین کے غلبہ کو ظاہر نہ فرماتا۔ اس کے بعد کہ آنحضرتؐ کو جو تمیم تھے پناہ دی اور جو محتاج تھے معنی بنایا، یہاں تک کہ آپ کا سینہ کھول دیا اور آپ کا ذکر بلند کیا، آپ کے ذریعہ اپنے دین کو ظاہر کیا اور اپنے کلمے اور حکم کو بلند کیا۔ پھر رسولؐ کے بعد خدا نے اس نور کا دوسروں کو خلیفہ بنایا جو پھونکوں سے نہیں بجھ سکتا اور نہ زبانوں اور لبوں کے جھٹلانے سے باطل ہو سکتا ہے۔“

کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ البیرونی جیسا فاضل اجل اور عالم متبحر جسکی پوری زندگی اعلیٰ قسم کی سائنسی تحقیق و تدقیق اور علمی موشگافیوں میں گزری، ایک لمحہ کے لئے بھی تشکیک میں مبتلا نہیں ہوا اور اپنے عقیدہ کے اظہار میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ کتاب الہند میں ہندوؤں کے رسم خط اور بعض رسوم کا ذکر جس باب میں ہے اس کے پہلے ہی پیرا گراف میں وہ اعلان کرتا ہے کہ ”پاک ہے وہ جو حکمت کے ساتھ پیدا کرتا اور مخلوق کے امور کو بہتر بناتا رہتا ہے۔“

یہ صحیح ہے کہ وہ ابو بکر الرازی کی تحریروں سے حوالے دیتا ہے اور اس کے ساتھ اس کا رویہ ہمدردانہ بھی ہے، لیکن الرازی کے برخلاف اس کے نظریہ کائنات کا، جیسا کہ اس کے ارضیات اور تہذیبوں کے تقابلی مطالعے سے ظاہر ہے، خدا نے خالق و قیوم قدیم کی کبھی نہ ختم ہونے والی حمد و ثنا سے ایک گہرا رشتہ ہے۔ یہی نہیں کہ البیرونی کے عقیدہ اور سائنس کے مابین کوئی بُعد نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی علمی تحقیقات کا سرچشمہ ایمان باللہ ہی سے پھوٹتا ہے اور تحقیق میں اس کی جووت طبع کی جڑیں اس کے مذہبی عقائد ہی میں پیوست ہیں۔ تمدن میں حدت عالم سے متعلق اس کی بحث کو دیکھئے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی

دیکھئے: ریاضہ القانون السعودی، دائرة المعارف حیدرآباد، صفحہ ۱۰۰

۲۲۳

۱۹۳۷ء، ص ۱۰۰

تحقیقات کے دوران خدا کو ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہیں کرتا۔

البیرونی ان مدعیانِ علم و حکمت میں سے نہ تھا جنہیں مذہب کو عقل انسانی کا  
 رکھنے پر اصرار تھا۔ وہ عقل انسانی کی حدود سے خوب واقف تھا۔ تاریخ اسلام  
 عقل و مذہب کا معرکہ شروع ہوا تھا تو مسائل الہی کے سلسلے میں کیسی کیسی موٹگائیاں  
 ہونی لگیں اور یہ سب اس کی نظر میں تھیں لیکن وہ خود اپنی خدا اور ذات سے کام  
 لے کر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ مذہب الہی عقل کا مخالف نہیں ہو سکتا، البتہ وہ اس کا  
 قائل نہ تھا کہ عقل انسانی ہمیشہ صراطِ مستقیم پر رہتی ہے۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ عقل انسانی  
 امور الہی کے تابع رہنا چاہیے اور اگر کبھی ایسی نشانیاں نظر آئیں جو ہماری فہم و ادراک  
 کے مطابق نہ ہوں تو ان نشانیوں کا انکار نہ کرنا چاہیے۔ اسی لئے وہ رازمی جیسے فلاسفہ  
 کی انتہا پسندانہ روشن خیالی اور بے روک تعقل پسندی کا مخالف ہے۔ اسی طرح وہ  
 ان لوگوں کا بھی مخالف ہے جو محض جہالت، تعصب اور تنگ نظری کی بنا پر کوئی نہ کوئی  
 مذہبی پہلو نکال کر سائنس اور فلسفہ کی مخالفت کرتے ہیں۔

البیرونی مورخ بھی تھا۔ وہ ایک ایسا مورخ تھا جو تہذیبوں اور ان کا تاسیسات  
 کا مطالعہ کرتا تھا اور اس سلسلے میں اس کا منہاج تحقیق زمانہ حال کے اصول تحقیق  
 سے کسی طرح کمتر نہیں کہا جاسکتا۔ وہ اپنے زمانے کی فن تاریخ نگاری کا مقلد نہ تھا وہ مجتہد تھا  
 اختراعی و تخلیقی صلاحیت کے وافر ذخیرے کے ساتھ اس کا مطالعہ غیر معمولی طور پر وسیع  
 اور گہرا تھا، ایک ایسے عہد میں جب کتابیں بڑی تعداد میں چھپتی نہ تھیں، علمی جرائد کا وجود  
 نہ تھا اور جو معلومات دستیاب تھیں ان میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے میں بڑی  
 دشواریاں تھیں، ہمیں جب البیرونی جیسا متبحر عالم ملتا ہے جو مختلف علوم میں مجتہدانہ نظر  
 اور منہاجات تحقیق میں منفرد فکر کا حامل تھا، تو ہم شوچنے لگتے ہیں کہ شاید عظیم شخصیت کا  
 نظریہ صحیح ہو، یعنی یہ کہ ہر عہد میں ایک ایسی استثنائی شخصیت ضرور ہوتی ہے جو اپنی  
 غیر معمولی ذہانت اور مضبوط قوت ارادی سے حالات کا رخ موڑ دیتی ہے اور اپنے عہد پر  
 اپنی شخصیت کا دوامی نقش چھوڑ جاتی ہے۔ علمی دنیا میں بھی ایسی شخصیتوں کی مثالیں ملتی ہیں  
 اور اس لحاظ سے البیرونی بلاشبہ نابغہ روزگار تھا۔

وہی مورخ اچھا مانا جاتا ہے جس کا جغرافیہ کا علم بھی اچھا ہو، البیرونی اس راز  
 سے واقف تھا اور اس کی جغرافیائی معلومات اعلیٰ درجہ کی تھیں۔ وہ واقعات و حقائق  
 سے کسی صورت میں بھی اپنا رشتہ منقطع نہیں کرتا اور ان کے بیان میں بڑی وضاحت  
 اور کامل احتیاط سے کام لیتا ہے لیکن وہ اسے بھی خوب سمجھتا ہے کہ تاریخ اور سائنس

دونوں کا منصب یہ ہے کہ وہ وقائع و حقائق سے آگے بھی دیکھیں۔ کیونکہ صرف واقعات کی کھٹونی سے کچھ سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ان کی تعبیر و تشریح ضروری ہے۔ البیرونی کا خیال تھا کہ تاریخ واقعات کے تسلسل کے علاوہ کچھ اور بھی ہے اور اصل تاریخ تصورات و ادارات ہی کی تاریخ ہوتی ہے۔ کتاب الہند کے مطالعے سے البیرونی کے تصور تاریخ سے متعلق یہی حقیقت سامنے آتی ہے۔ اس کی اس تصنیف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خیال میں اہل ہند کے عقائد، مذہبی رسوم و آداب اور تہذیبی خصائص کو اس وقت تک گہرائی اور سچائی سے بیان نہیں کیا جاسکتا تھا جب تک کہ ان کے فلسفے اور نظریہ حیات کو اچھی طرح سمجھ نہ لیا جائے۔ البیرونی سے پہلے جو مسلم جغرافیہ داں اور اقوام و ملل کے موضوع پر لکھنے والے گذر چکے تھے ان کے یہاں ہمیں وہ ہمہ گیری، گہرائی، مقصدیت اور باضابطگی نہیں ملتی جو اس خوارزمی عالم کے یہاں ملتی ہے۔ کتاب الہند سے صرف یہی نہیں پتہ چلتا کہ اس کے مصنف کو اہل ہند کے احوال و عقائد کے جاننے کا شوق تھا، بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ شوق برائے شوق اور اس کا یہ تجسس برائے تجسس نہ تھا۔ وہ درحقیقت یہ چاہتا تھا کہ ایک ایسی تہذیب سے جو اس کی اپنی اور اپنے ہم مذہبوں کی تہذیب سے بالکل مختلف اور متضاد تھی، ایسا رشتہ قائم ہو جائے کہ دونوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے میں آسانی ہو، اس کتاب کے دیباچے میں اس نے لکھا ہے کہ

”استاد موصوف . . . . کی یہ خواہش ہوئی کہ جو کچھ ہم کو ہندوؤں کے بارے میں معلوم ہوا ہے وہ قلمبند کر دیا جائے تاکہ ان لوگوں کو جو ان سے بحث و مباحثہ اور تبادلہ خیال کرنا چاہیں اس سے مدد ملے اور جو لوگ ان سے میل جول پیدا کرنا چاہیں ان کے لئے بھی کارآمد ہو . . . . ہم نے اس کو اس طرح لکھ ڈالا کہ اس میں کسی فریق کی ٹرن کوئی ایسا قول منسوب نہیں کیا ہے جو اس کا نہیں ہے اور نہ اس کا کلام نقل کرنے سے اگر وہ حق کے مخالف اور اہل حق کو اس کا سنا گراں ہو، احتراز کیا ہے۔ وہ اس فریق کا اعتقاد ہے اور وہ اپنے اعتقاد سے بخوبی واقف ہے۔“

البیرونی نے تحصیل علم اور تحقیق فن کی ہر منزل میں شاہد سے اور تجربے کی ضرورت پر اصرار کیا اور ایک سچے سائنس داں کی مانند ان لوگوں کو لائق اعتنا نہیں سمجھا جو بغیر

۱۔ یعنی ابوسہل عبدالمنعم ابن علی ابن نوح تفسی کتاب الہند، اردو ترجمہ، صفحہ ۱۷

۲۔ کتاب الہند اردو ترجمہ، جلد اول، صفحہ ۸

تفقید اور جانچ کے روایت کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ تفریق پرستی کا مخالف تھا اور کہا کرتا تھا کہ اپنی عالمگیر سچائیوں کی سطح پر تمام مذاہب ایک ہیں، اگر ناحق کی طرفداری اور تائید میں غلو کیا جائے تو حیات کے مناسب طریقے سے بہک جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن جس شخص کا مقصد اللہ اور اللہ کے واسطے حق ہوتا ہے، اللہ اس کو ثابت قدم رکھتا ہے۔

ابوریحان البیرونی ایک ایسا معقول سائنس دان تھا جو اس حماقت میں کبھی مبتلا نہیں ہوا کہ تجربی سائنس کے اصول تحقیق سے مذہب اور علوم انسانی کے شعبہ میں کام لے۔ اس سلسلے میں اس کا نظریہ علم بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کا نظریہ علم یہ تھا کہ علم کی مختلف شکلیں بتدریج ارتقاء کے مراحل سے گذرتی رہتی ہیں لیکن وہ بنیادی علم جس کا سرچشمہ وحی الہی ہے، تغیر پذیری سے مبرا ہے۔ علوم پر جب بھی اُس نے لکھا اس کا خیال رکھا کہ پہلے ان کے ارتقاء کی تاریخ بیان کر دے۔ تاریخ مذاہب اور مذاہب کے تقابلی مطالعے کا بانی تو وہ ہے ہی، غور سے دیکھئے تو ایک لحاظ سے اس نے تاریخ سائنس کی بھی بنیاد رکھی۔ لیکن اُس نے کبھی اور کسی حالت میں بھی غیر تغیر پذیر علم کو فرو گذاشت نہیں کیا جس کی کوکھ سے تمام انسانی علوم جنم لیتے اور رد و اضافہ کے مراحل سے گذر کر ارتقاء کی راہوں کو طے کرتے رہتے ہیں۔

سائنسی علوم کی دنیا میں البیرونی نے جو کار نمایاں انجام دیا، عام طور پر لوگوں کی توجہ اسی طرف رہی ہے اور یہ بات نظروں سے اوجھل رہی کہ اپنے عہد میں اور غالباً پوری تاریخ اسلام میں وہ واحد فرد ہے جس نے مذاہب کے تقابلی مطالعے کی ڈسپلن کو ایک نیا رخ دیا اور اس شعبہ علم میں اپنے پیش روؤں سے بہت آگے نکل گیا۔ قبل اس کے کہ اس سلسلے میں البیرونی کی امتیازی خصوصیت بیان کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جرمن مستشرق ایڈورڈ سخاؤ کا شکر یہ جذبہ احسان مندی کے ساتھ ادا کیا جائے جس نے اس کی دو معرکتہ الآراء تصانیف آثار الباقیہ اور کتاب الہند کو ایڈٹ کر کے شائع کیا اور ساتھ ہی انگریزی اور جرمن ترجمے بھی طبع کر لئے۔ ۱۹۴۱ء میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نے کتاب الہند کا جو اُردو ترجمہ شائع کیا اس میں بھی سخاؤ کے انگریزی ترجمے سے مدد لی گئی، لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے آثار الباقیہ کا ترجمہ اردو میں ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ آثار الباقیہ کے دیباچے میں البیرونی نے اپنے طریق تحقیق کا ذکر کیا ہے اور چونکہ ثقافتوں اور مذہبوں کے تقابلی مطالعے میں یہ طریق تحقیق بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

وہ اسی بنا پر ہم اُسے اس ڈسپلن کا بانی کہتے ہیں، ضروری ہے کہ اس کا ذکر کر دیا جائے۔  
 اس میدان میں اپنے اکثر پیش روؤں کے بارے میں اس کی رائے اچھی نہ تھی، لیکن اس کا  
 خیال تھا کہ اگر تحقیق کا صحیح طریقہ اپنایا جائے تو دوسرے مذاہب کے عقائد و احکام  
 غیر جانبداری کے ساتھ بیان کئے جاسکتے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اپنی دونوں مذکورہ  
 بالا کتابوں میں اُس نے اپنے طریق تحقیق پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

”... ادباء میں سے ایک صاحب نے مختلف قوموں کی تواریخ (سنین)  
 کی کیفیت اور ان کے اصول میں اختلاف کی وجہ مجھ سے دریافت کی۔  
 یعنی تاریخیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور ان کے حصے یعنی سال اور  
 مہینے جن پر وہ مبنی ہیں، کیا ہیں، علاوہ برس وہ کیا اسباب تھے جن کی  
 وجہ سے یہ اختلاف پیش آیا۔ نیز کون کون سے مشہور تیمار اور میلے یا دیگر  
 ایام، مخصوص اوقات اور رسوم وغیرہ ہیں جو مختلف قوموں میں رائج ہیں۔  
 صاحب مذکور نے اصرار کیا کہ ان امور کی تشریح ایسی وضاحت کے ساتھ  
 کر دو کہ یہ باتیں پڑھنے والے کے بخوبی ذہن نشین ہو جائیں اور اُسے  
 متفرق کتابوں اور گذشتہ معنیوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ  
 رہے مجھے معلوم تھا کہ یہ ایک نہایت دشوار اور مشکل انصوں کام ہے بالخصوص  
 اس شخص کے لئے جو ان باتوں کو اس پیرا میں لکھنا چاہے کہ پڑھنے والے  
 کے دل میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے ...

”ان مسائل کی بہترین تشریح کے لئے گذشتہ قوموں کے اخبار و  
 روایات جاننے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ ان میں سے اکثر ان کی باقی ماندہ  
 دینی و دنیوی رسوم پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ مقصد محض عقلی استدلال (استلال  
 بالمعقولات) یا مشاہدہ محسوسات پر قیاس کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا،  
 بلکہ اہل کتب اور اصحاب الآرا اور ارباب ملل کے متداول اور صحیح خیالات  
 مطلع ہونے اور ان معلومات کی بنا پر بجائے خود غور کرنے سے یہ گوہر مقصود  
 حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس بارے میں خود ان کے مختلف اقوال  
 اور خیالات کا موازنہ ضروری ہے۔

”لیکن سب سے پہلے واجب ہے کہ اپنے نفس کو ان عوارض اور اسباب  
 سے خالی کر لیا جائے جو اکثر لوگوں کو سچائی کے دیکھنے سے اندھا کر دیتے

ہیں، مثلاً، عادت مالوفہ، تعصب، جوش فطمدی، خو غرضی، خیال مقصد برآری وغیرہ وغیرہ، جس طریقے کا میں ذکر کر رہا ہوں یہی گوہر مقصود کو پانے اور شواہب شبہ و شکوک کے رفع کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ اس کے بغیر چاہے کتنی ہی سخت اعتنا اور کوشش کی جائے ناممکن ہے کہ یہ غرض پوری ہو جائے۔ لیکن اس کو میں مانتا ہوں کہ جو اصول اور طریقے ہم نے مقرر کئے ہیں، ان پر عمل پیرا ہونا سہل نہیں ہے، بلکہ بعد اور صعوبت کی وجہ سے شبہ ہوتا ہے کہ ان تک پہنچنا ناممکن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تمام اخبار و روایات میں اکثر جھوٹی باتیں داخل ہو گئی ہیں اور ظاہر یہ باتیں ناممکنات سے بھی نہیں معلوم ہوتیں کہ انہیں آسانی سے پہچان کر نکال دیا جائے۔ بہر حال ہم نے روایات و اخبار کو ممکن الوقوع تصور کر لیا اور بطور صحیح روایات کے مان لیا ہے بشرطیکہ دوسرے شواہد سے ان کا بطلان نہ ہوتا ہو۔ اس لئے کہ ہم احوال طبعی میں خود ایسی باتیں دیکھتے ہیں اور ہم سے پہلے بھی لوگوں نے بار بار ایسی باتیں دیکھی ہیں کہ اگر ان کے مثل پچھلے زمانے کی کوئی روایت ہوتی تو ہم کہہ اٹھتے کہ یہ تو ناممکن ہیں۔ اس کے سوا عمر انسانی ایک ہی قوم کے اخبار جاننے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی، پس یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ بے شمار قوموں میں تمام قوموں کے اخبار معلوم ہو جائیں یہ قطعاً ناممکن ہے۔

”جب معاملات کی یہ کیفیت کھڑی تو ہم پر واجب ہے کہ زیادہ قریب کی باتوں سے کم قریب کی باتیں اور زیادہ معلوم شدہ باتوں سے کم معلوم شدہ باتیں اخذ کریں اور جہاں تک ہو سکے انہیں صحیح کر دیں۔ روایات کو ان لوگوں سے ہم پہنچائیں جن کا تعلق روایات سے ہے، جہاں تک ہو سکے ان کی اصلاح اور درستی کی کوشش کریں اور باقی کو ان کے حال پر چھوڑ دیں تاکہ ہمارے اس عمل سے طالب حق اور محب حکمت کو دوسرے مضامین کی تحقیقات اور ان امور کے دریافت کرنے کا موقع ملے جو ہمیں معلوم نہیں ہو سکے۔ ہم نے خدا کی مدد سے اسی پر

عمل کیا ہے“ (دیباچہ آثار باقیہ)

البریدنی کا طریق تحقیق تقابلی تھا۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ اُس شخص کے لئے آسان ہو سکتا ہے جو موجودہ مذاہب میں سے کسی کا پیرو نہ ہو، لیکن البریدنی کے ساتھ یہ معاملہ نہ تھا۔ وہ مذاہب اسلام کا پیرو تھا اور ہم نے دیکھا کہ قانون مسعودی کے دیباچے میں



متعلق براہ راست انہیں کی کتابوں سے استفادہ کیا۔ کتاب الہند کے باب اول میں اُس نے اس سلسلے کی ان تمام مشکلات و موانع کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جو سنسکرت زبان کے سیکھنے اور ہندوؤں کی کتابوں سے استفادہ کرنے کے دوران اسے پیش آئے۔ بلاشبہ یہ آسی کا بے پناہ صبر و استقلال اور اسی کی بے لگت قوت ارادہ کی تھی جو اس راہ کی دشواریوں پر قابو پا سکی۔

الہی رحمت بر خاک او کن کرامت ہا بجان پاک او کن

میں براہ عزیز مسیح احسن صاحب کا حد درجہ ممنون ہوں کہ پچھلے مہینے انہوں نے یہ مژدہ جانفرا سنایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے اُس مقالہ کی جس کا عنوان "البیرونی اور جغرافیہ عالم" ہے، ایک نقل ان کے پاس ہے، چونکہ یہ مقالہ جہاں تک ہمارے علم میں ہے، ابھی غیر مطبوعہ ہے، اس لئے ان سے ان کی نقل کی ہوئی کاپی لے کر ایک عالم اُس نے خدا اور اس کے رسول پر اپنے ایمان کا برملا اعلان کیا ہے، پھر وہ جس ماحول میں زندگی گزار رہا تھا، مذہب میں راسخ العقیدگی کا ماحول تھا۔ سلطان محمود کی فتمندی کے جوش و خروش کا ماحول تھا، اُسے معلوم تھا کہ اس کی کتابیں اسی راسخ العقیدگی کی نام فضا میں پڑھی جائیں گی، پھر بھی وہ اپنے مطالعے میں پوری غیر جانبداری اور کمال معرفت سے کام لیتا ہے اور کہیں بھی تعصب کی پرچھائیں نہیں پڑنے دیتا۔ وہ نہ تو اسلام کی برتری کا اعلان کرتا ہے اور نہ یہ جتا ہے کہ مسلمانوں کی تہذیبی و علمی ترقی کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آج بھی اس شعبہ علم کے محققین میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ملے گا جس میں البیرونی کی سنی غیر جانبداری اور معرفت ہو۔ اُس کے ساتھ یہ سعادت خاص عطیہ الہی تھی۔

ہمارا یہ نابغہ روزگار کئی زبانیں جانتا تھا، مثلاً ہندی اور خوارزمی (جو فارسی کی دو صورتیں تھیں)، عربی، عبرانی، سریانی اور سنسکرت۔ اپنے مشہور ہندو ہندو سنی اور دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں اُس کا رتبہ یوں بھی بلند ہے کہ انہوں نے یونانی فلسفہ اس کے عربی تراجم سے سیکھا تھا۔ انہوں نے براہ راست یونانی زبان میں اسے نہیں پڑھا تھا لیکن البیرونی نے نہایت مشقت و جانفشانی سے سنسکرت زبان کی اپنی لغوی و نحوی مشکلات اور اہل ہند کے مخالفانہ رویے کے باوجود سنسکرت سیکھی اور اتنی سیکھی کہ اس پر پورا عبور حاصل کیا، اور پھر اہل ہند کے فلسفہ و علوم اور عقائد و رسوم سے

خود رنگی میں پڑھی، خیال آیا کہ اسے چھپنا چاہئے چنانچہ میں انھیں لے کر آزاد بھون پہنچا اور اصل سے لفظ بہ لفظ اس کا مقابلہ کیا اور اس میں ضروری تصحیح کی۔ اس مخطوطے کی کہانی مسیح الحسن صاحب نے بیان کر دی ہے جو دلچسپ اور معلومات افزا ہے مخطوطے میں عبارت اور املا جمل طرح قلم بند ہیں انھیں اسی طرح برقرار رکھا گیا ہے، البتہ میں نے کہیں کہیں ضروری حاشیے لکھ دیئے ہیں۔ مقدمہ لکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ مجھ جیسا کم علم اور سچیدان شخص کے لئے یہ مناسب نہیں، لیکن اس خیال سے میں نے جسارت کی ہے کہ مختلف علوم و فنون میں البیرونی کو جو امتیاز حاصل تھا اس کی ایک جھلک تو قارئین دیکھ ہی لیں اور ساتھ ہی اس فرورید کی زندگی کے حالات سے بھی انھیں کچھ واقفیت حاصل ہو جائے۔

اس مقدمہ میں میں نے خاص طور پر سید حسن برنی کے رسالے 'البیرونی' سے جس کا دوسرا ڈیشن ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا، استفادہ کیا ہے، لیکن پچھلے پچاس سال میں خود البیرونی کی بعض تصانیف دنیا کے مختلف کتب خانوں میں دستیاب ہوئیں پھر اس کی یاد میں مختلف علوم کے ماہرین نے بیش قیمت تحقیقی مقالے لکھے اور البیرونی اور اس کے علمی کارناموں سے متعلق ایسی نئی نئی معلومات سامنے آئیں جو سید حسن برنی کے رسالے میں نہیں ملتیں اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ برنی کا رسالہ کئی لحاظ سے آج بھی ان تمام عالمانہ تحریروں میں جو دنیا کی کسی زبان میں البیرونی کی زندگی اور اس کے علمی کمالات پر لکھی گئی ہیں، ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خود مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنے مقالے کی تصنیف کے وقت اس رسالے کو ضرور پڑھا ہوگا۔

شکر گزار ہوں میں انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز (آزاد بھون) کا کہ مولانا آزاد کے اس غیر مطبوعہ مقالے کی اشاعت کی اجازت دی اس کے لائبریرین گلزار احمد نقوی صاحب کا جنھوں نے مخطوطہ مذکورہ کو دیکھنے سے پڑھنے اور اس سے استفادہ کرنے میں وہ تمام آسانیاں فراہم کیں جو ایسے کام میں ضروری ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائبریرین، شہاب الدین انصاری صاحب نے مطلوبہ کتابوں کی فراہمی میں پوری مدد کی، میرا جذبہ منت گذاری ان کے لئے بھی ہے۔ شاہد علی خاں صاحب منیجر مکتبہ جامعہ لیڈ اور عبد اللطیف اعظمی صاحب کی سعی و توجہ کے بغیر اس کی طباعت میں بڑی دقتیں ہوتیں میں ان کا بھی ممنون ہوں

ضیاء الحسن فاروقی

۲۳ جون ۱۹۷۲ء

## کچھ مخطوطے کے بارے میں

مولانا ابوالکلام آزاد کا مقالہ ”البیرونی اور جغرافیہ عالم“ ایک قلمی مخطوطہ ہے جو ۱۳۲۰ء کے ۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مخطوطے کے بعض صفحات پر مولانا کے قلم سے بعض اصلاحیں بھی ہیں۔ مولانا آزاد کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے، اس کا حوالہ سب سے پہلے ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اپنی کتاب مولانا ابوالکلام آزاد میں دیا ہے جو ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ شاید اس کتاب کو پڑھنے کے بعد عرش لمبانی صاحب نے اپنی کتاب ”ابوالکلام آزاد“ مطبوعہ ۱۹۶۴ء میں اس کا ذکر کیا تھا۔ بجز حوالے اور اس مقالے کی موجودگی کی نشاندہی کے کسی نے کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔ ڈاکٹر بیدار نے یقیناً اس مسودے کو انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کی لائبریری میں ان کتابوں کے ساتھ دیکھا تھا جو آزاد کلکشن کے نام سے جداگانه ایک اماری میں محفوظ کر دی گئی تھیں۔ یہ کام میری ہی نگرانی میں اس وقت انجام دیا گیا تھا جب ۱۹۶۰ء یا ۱۹۶۱ء میں کونسل پٹودی ہاؤس، کرزن روڈ، نئی دہلی سے موجودہ نئی عمارت آزاد بھون میں منتقل ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے آزاد کلکشن کا کوئی وجود نہ تھا۔ لہذا یہ مخطوطہ ۱۹۶۱ء سے پہلے سوائے آزاد بھون کی لائبریری کے اسٹاٹ کے کسی دوسرے کی نظر سے نہیں گذر سکتا تھا، ممکن ہے اجمل خاں صاحب مرحوم، جو ایک عرصے تک مولانا آزاد کے پرسنل سیکرٹری تھے، اس کے وجود سے واقف رہے ہوں۔

میں نے بھی اس کی اہمیت اس وقت سمجھی جب میں نے ۱۹۶۸ء میں مولانا کے حواشی پر کام شروع کیا۔ اُسے قریب قریب اسی زمانے میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور محمد تقی صدیقی صاحب سے میری ملاقات آزاد بھون میں ہوئی۔ مجھے اپنی طرح یاد ہے کہ جب بیدار صاحب

۱۔ دوسرے معنیوں کی کتابوں کے حاشیوں پر لکھے ہوئے مولانا کے قلمی تبصرے میں نے الگ ایک کتاب کی صورت میں ”حواشی ابوالکلام آزاد“ کے نام سے مرتب کئے ہیں۔

اپنی کتاب لکھنے میں مصروف تھے تو اکثر آزاد بھون کی لائبریری میں تشریف لاتے تھے۔ آزاد کلکشن کی الماری کی ایک ایک کتاب انھوں نے میری موجودگی میں دیکھی۔ اسی زمانے میں اس مخطوطے پر ان کی نظر پڑی اور اس کے بعد انھوں نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا۔ مولانا آزاد سے متعلق مطبوعہ کتب و رسائل میں اس مخطوطے سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی میں نے بہت کوشش کی۔ مولانا آزاد کی تصانیف دیکھیں، ان کے خطوط پڑھیں، دوسروں کی تحریریں مطالعہ کیں، خاص کر ان ارباب علم و فضل کی جن سے مولانا کے علمی روابط تھے، مگر اس کے متعلق کوئی سراغ نہیں ملا۔ ایک بار محمد عتیق صدیقی صاحب نے دوران گفتگو فرمایا تھا کہ انھوں نے مولانا غلام رسول تہر کی اس سلسلے میں خط لکھا تھا کہ اس قسم کا ایک مخطوطہ آزاد بھون کی لائبریری میں موجود ہے، اس کے جواب میں مولانا موصوف نے عتیق صاحب کو لکھا کہ شاید ۱۹۴۹ء سے پہلے اس مقالے کا مسودہ بغرض اشاعت مولانا ابوالکلام آزاد نے لاہور بھیجا تھا لیکن یہ مقالہ اس وقت چھپ نہ سکا۔ مولانا تہر نے بقول عتیق صدیقی صاحب، خدا کا شکر ادا کیا کہ مقالہ آزاد بھون کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ عتیق صدیقی صاحب اور مولانا تہر کے درمیان کس زمانے میں یہ مراسلت ہوئی، مجھ کو اس کا علم نہیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ مقالہ مولانا نے ۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیانی عرصے میں کسی وقت لکھا ہے۔ مولانا کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں پر لکھنے والوں کی تحریریں شاہد ہیں کہ سیاسی اور ملکی مسائل میں بے پناہ مشغولیت کے باوجود مولانا کے علمی شغف میں کبھی کمی نہیں آئی، پھر بھی یہ مقالہ ان کے بالکل آخری زمانے کی تصنیف نہیں کہی جاسکتی۔ کتاب کے کچھ مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ مقالہ ۱۹۴۱ء کے بعد لکھا ہوگا، مقالے کے شروع میں مولانا آزاد نے البیرونی کی تصنیف القانون المسودی کے مختلف نسخوں پر بحث کی ہے اور استنبول یونیورسٹی کے ایک پروفیسر اے آر کی ولیدی توفان کی البیرونی سے متعلق قابل ستائش تحقیقات پر روشنی ڈالی ہے، پروفیسر موصوف نے ترکی میں موجود القانون المسودی کے چند نسخوں اور البیرونی کی چند دیگر تصانیف کی نشان دہی کے بعد القانون کو از سر نو مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اپنی سعی و ہمت کے نتیجے میں پروفیسر توفان نے پوری کتاب کی اشاعت سے پہلے جغرافیہ عالم کے متعلق القانون کی جدولوں کی ترتیب و تدوین کی اور انھیں ترکی میں دریافت شدہ البیرونی کی دو اور کتابوں، تحدید نہایات

۱۔ عتیق صاحب فرماتے ہیں کہ وہ خط ان کے پاس موجود ہے۔

الاماکن اور الفیڈنٹہ کے مستخرجات کے ساتھ صفحہ المعمورہ علی البیرونی کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی اور ایک دیباچہ بھی لکھا۔ پروفیسر توغان اگرچہ اپنے اس کام سے ۱۹۲۷ء میں فارغ ہو چکے تھے لیکن ان کی یہ علمی کاوش ۱۹۲۷ء سے پہلے کہیں شائع نہ ہو سکی، بالآخر سر جان مارشل کی توجہ سے گورنمنٹ آف انڈیا نے اس کتاب کو دہلی سے شائع کیا۔ مولانا آزاد نے یہی جیل میں اس کتاب کا مطالعہ ۱۹۴۱ء میں کیا تھا، کتاب کے سرورق پر مولانا کے دستخط مع تاریخ اس طرح موجود ہیں:

”ابوالکلام - یہی جیل، ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۱ء“

پروفیسر توغان کی کتاب پر مولانا نے حاشیے بھی لکھے ہیں اور چونکہ پروفیسر ندکور کی فاضلانہ کوششوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس لیے قیاس یہی ہے کہ مولانا نے اپنا یہ مقالہ ۱۹۴۱ء کے بعد لکھا، جب ہی یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ بقول مولانا غلام رسول بہرہ رزایت جناب نسیق صدر لکھی، یہ کتاب ۱۹۴۷ء سے پہلے برائے اشاعت لاہور بھیجی جائے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، مولانا آزاد نے اپنے مقالے کی بنیاد پروفیسر توغان کی صفحہ المعمورہ پر رکھی ہے۔ پروفیسر توغان کی کتاب ۱۹۲۷ء میں مکمل ہو گئی تھی۔ اسی سال یعنی ۱۹۲۷ء میں سید حسن برنی کی کتاب البیرونی کا دوسرا ایڈیشن کا نیا ترمیم و تنسیخ اور اضافے کے بعد چھاپا گیا تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ سید حسن برنی اور پروفیسر توغان تقریباً ایک ہی زمانے میں البیرونی کے علمی کارناموں پر تحقیقات کر رہے تھے، لیکن ایک دوسرے کی کوششوں سے بے خبر تھے۔

پروفیسر توغان نے القانون المسعودی کی جدولوں کی ترتیب میں القانون کے چند نئے دریافت شدہ نسخوں کے علاوہ تین دوسرے کاپی حاصل شدہ کتابوں سے استفادہ کیا تھا۔ ان تین ہی کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ تحدید نہایات الاماکن تصنیح مسافات المساکن

۲۔ الجہا ہرنی معرفت الجواہر

۳۔ الفیڈنٹہ

سید حسن برنی نے اپنی کتاب میں البیرونی کی تصانیف کی جو فہرست درج کی ہے اس میں یہ تینوں کتابیں شامل ہیں، لیکن پروفیسر توغان کی تحقیقات اور جدوجہد کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے، البتہ ۱۹۲۷ء میں ایران سوسائٹی کلکتہ سے شائع ہونے والی جس کا مفصل ذکر آگے آئے گا، البیرونی کی ہزار سالہ یادگار جلد کے ایک مقالے میں اور ایران سوسائٹی ہی کے ایک جلد میں، ۲۴ مارچ ۱۹۵۲ء کو البیرونی کی سائنسی خدمات پر ایک

مقالہ پیش کرتے ہوئے، سید حسن برنی نے جا بجا پروفیسر قونغان کی مسافت المعمورہ اور ان کی چند دیگر تالیفات کے حوالے دینے ہیں۔ سید حسن برنی کے یہ دونوں مقالے انگریزی میں ہیں۔ مولانا آزاد نے بھی اپنے اس مقالے میں سید حسن برنی کے مقالوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی زیر بحث تصنیف کا جو زمانہ ہم نے متعین کیا ہے، قریب قریب اسی زمانے میں ہندوستان اور دوسرے ممالک میں البیرونی پر مزید تحقیقاتی کام کئے گئے۔ ۱۹۳۸ء کو سنہ ہجری کے لحاظ سے البیرونی کا ہزار سالہ یادگار سال قرار دیا گیا۔

۱۹۴۶ء میں ایران سوسائٹی، کلکتہ نے ایک پروگرام مرتب کیا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ دسمبر ۱۹۴۸ء میں البیرونی کی ہزار سالہ تقریبات منعقد کی جائیں، مگر ان تقاریب کا انعقاد اس وقت ملک کی عالیہ آزادی کی وجہ سے ملتے ہی ہو گیا، تاہم بین الاقوامی شہرت کے اسکالروں کے مقالات پر مشتمل ایک یادگار جلد کی ترتیب کا سلسلہ جاری رہا اور یہ جلد ۱۹۵۱ء میں مکمل ہو کر ایران سوسائٹی، کلکتہ سے شائع ہو گئی۔ ۱۹۴۸ء کی مجوزہ ہزار سالہ تقاریب مارچ ۱۹۵۲ء میں منائی گئیں، اس موقع پر اس یادگار جلد کا اجراء ہوا۔ یہ جلسہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۲ء کو منعقد ہوا جس کی صدارت اُس وقت کے مندری بنگال کے گورنر جناب ایچ، سی، مکر جی نے فرمائی۔ ان تمام کوششوں کو حکومت ہند کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا آزاد کی علمی تائید حاصل رہی۔ یادگار جلد کی دو سو کاپیاں مولانا کی سفارشات پر حکومت ہند کے لئے وقت کر دی گئیں۔ ان تقاریب کے انعقاد کا اہتمام انڈین کونسل فار کولرل ریسٹنٹز کی جانب سے ہوا، یہ ادارہ اُس زمانے میں وزارت تعلیم سے وابستہ تھا اور مولانا آزاد وزیر تعلیم کی حیثیت سے اس کے صدر تھے۔ مولانا کی اس نمایاں وابستگی کے باوجود ان تقاریب میں ان کی براہ راست شرکت کا پتہ نہیں چلتا اور نہ ہی ان کے اس مقالے کا کسی پہلو سے کوئی سراغ ملتا ہے۔ ہندوستان کی اس یادگار تقریب کے علاوہ جولائی ۱۹۴۸ء میں پیرس میں بین الاقوامی مستشرقین کی اکیسویں کانگریس کے زیر اہتمام ایک خصوصی اجلاس البیرونی کی ہزار سالہ یادگار کے سلسلے میں منعقد ہوا جس میں دنیا بھر کے ارباب علم و فضل نے البیرونی کے عظیم کارناموں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ہندوستان کی نمائندگی پروفیسر سنتی کمار چٹرجی نے کی۔

ہجری تقویم کے لحاظ سے البیرونی کی ہزار سالہ یادگار منانے کے موقع پر اس عظیم المرتبت محقق و مفکر کے بارے میں جو تحقیقاتی کام ہوا اور جس تک میری رسائی ہوئی، یہ اس کا ایک اجمالی خاکہ ہے، یقین ممکن ہے کہ دنیا کے دوسرے گوشوں میں کچھ مزید تحقیقات ہوئی ہوں۔ سنہ عیسوی کے لحاظ سے ۱۹۴۳ء میں البیرونی کی ہزار سالہ یادگار منانے کا دوسرا دور شروع ہوا، یہ مولانا آزاد کی وفات کے بعد کا دور ہے۔ ستمبر ۱۹۴۳ء میں ایران

میں ایک بین الاقوامی کانگریس منعقد ہوئی جس میں اطراف عالم کے ماہرین مشرقیات نے شرکت کی۔ اس کانگریس کے اجلاس کئی دن تک جاری رہے اور مشہور و معروف شخصیتوں نے تحقیقی مقالے پڑھے۔ ان مقالوں پر مشتمل دو ضخیم جلدیں، نامہ بیرونی کے نام سے شوریائی عالی فرہنگ و مہتر نے ۱۹۱۹ء میں شائع کیں، پہلی جلد میں فارسی مقالات ہیں، دوسری جلد انگریزی اور فرانسیسی مقالات پر مشتمل ہے۔ پاکستان میں بھی یہ یادگار، عالمی پیمانے پر منائی گئی اور پاکستان کی وزارت تعلیم، یونسکو اور ہمدرد فاؤنڈیشن کے باہمی اشتراک اور اتحاد و عمل سے یہ کام بڑے تنگ و احتشام کے ساتھ صورت پذیر ہوا اور ۱۹۶۹ء میں ہمدرد اکیڈمی کراچی نے البیرونی سے متعلق تحقیقی مقالات پر مشتمل ایک نہایت شاندار کتاب شائع کی۔

آخر میں یہ اظہار کر دینا ضروری ہے کہ اس مخطوطے پر مولانا آزاد کے دستخط کہیں موجود نہیں ہیں اور نہ ہی مخطوطہ نویس نے ان کا نام تحریر کیا ہے، البتہ جلد بندی کے وقت تختہ جلد کے وسط میں کتاب کے نام کے ساتھ ساتھ مولانا کا اسم مبارک ثبت کر دیا گیا ہے۔ مخطوطے پر نام نہ ہونے کی وجہ سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید یہ مولانا کی تصنیف نہ ہو، لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے کہ مخطوطہ کسی دوسرے شخص نے لکھا اور مولانا نے بعد میں اصلاح کی، اصلاح لیتنا مولانا کے ہاتھ کی ہے، جس کی صحت میں کسی شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہے، کیونکہ میں نے اصلاح کی تحریر کو مولانا کی دوسری تحریروں سے موازنہ اور تقابلی کر کے دیکھا ہے اور انہیں ایک دوسرے سے بالکل مماثل پایا، نیز مولانا کی اس تصنیف کا طرز نگارش ان کی دوسری نگارشات سے بالکل مشابہہ ہے، حقائق و واقعات کی تلاش و جستجو کے بعد ان کو دلائل و براہین کے ساتھ مربوط و منضبط کر کے نتائج اخذ کرنے اور بیان کو موثر بنانے کا جو طریقہ مولانا نے اپنی دوسری تحریروں میں اختیار کیا ہے وہی اس کتاب کی عبارت میں بھی موجود ہے۔ ان حقائق و شواہد کی روشنی میں اس مختصر رسالے کو مولانا کی تصنیف تسلیم کر لینے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

ناشکری ہوگی اگر میں اس شہ پارے کو منظرِ عام پر لانے کے سلسلے میں ایک محترم اور علم دوست شخصیت اور چند دوسرے معزز دوستوں کا شکریہ ادا نہ کروں۔ ان اصحاب کی مساعی جمیلہ کی بدولت اس کام کی اشاعت ایسے وقت میں ممکن ہوئی جبکہ میں بالکل ناامید ہو چکا تھا۔ یہ شخصیت جناب نعیم الحسن فاروقی کی ہے جو جامعہ کالج

کے پرنسپل، ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈائریکٹر اور اس کے سہ ماہی رسالے، اسلام اینڈ دینی میڈیٹرن ایجنڈا انگریزی، اسلام اور عصر جدید (اردو)، اور ماہنامہ جامعہ کے مدیر ہیں۔ انھی صاحب نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اس کی ترتیب و تدوین کی اور چند ضروری عایشے لکھے اور پھر اپنے علمی ذوق کی وجہ سے اس رسالے کی اشاعت کا کام اپنے ذمہ لیا اور اب بطور مقدمہ البیردنی پر ایک جامع مضمون لکھ کر اپنی نیکگانی میں ڈاکٹر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے شائع کیا ہے۔

جناب شہاب الدین انصاری، لائبریریئن ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جناب ڈاکٹر محمد ذاکر ریڈر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ان معزز دوستوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے بروقت اور مفید افکار اور مشوروں سے میری مدد فرمائی۔ میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں، جناب گلزار احمد نقوی، لائبریریئن، انڈین کونسل فار کالج ریسٹنر، آزاد بھون کا تہہ دل سے مومن ہوں کہ انہوں نے اپنی لائبریری میں اس مخطوطے سے استفادہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ جناب خواجہ منیر احمد، جو لائبریریئن، آزاد بھون کا بھی میں شکریہ ادا کرتا ہوں، مومنوں آزاد کلکشن کے انچارج ہیں اور مجھ کو ہمیشہ ان کا تعاون حاصل رہا۔

مسیح الحسن  
۲۱ جون ۱۹۹۷ء



## البیرونی اور جغرافیہ عالم

ابوریحان البیرونی نے جغرافیہ اور ہیئت

القانون المسعودی کے مباحث پر متعدد کتابیں لکھی تھیں اور اپنے

پیشروں کی بیرونی تصحیح کی تھی۔ وہ جب "کتاب الہند" کی تصنیف سے فارغ

ہو چکا تو اسے خیال ہوا کہ اب ایک ایسی جامع کتاب مرتب کرنی چاہیے جس میں ان تمام مباحث کا خلاصہ یک جا ہو جائے۔ اس کی زندگی کا یہ آخری زمانہ فراغت اور خوشحالی کا زمانہ تھا کیونکہ اب سلطان محمود غزنوی کی جگہ جس سے اس کے تعلقات ہمیشہ مکدر اور مشتبہ رہے، اس کا علم دوست لڑکا سلطان مسعود تخت نشین تھا اور البیرونی کے علم و فضل کی منزلت شناسی کے لیے سازگار فضا پیدا ہو گئی تھی۔ قدرتی طور پر صورت حال کی اس تبدیلی نے بھی ایک مزید محرک کا کام دیا اور غالباً سنہ ۱۰۳۱ء میں اس نے سلطان مسعود کے نام سے معنون کر کے القانون تصنیف کی۔ یہ کتاب جیسا کہ ڈاکٹر اڈورڈ سخاؤ نے بجا طور پر لکھا ہے البیرونی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے رویہ چہ کتاب الہند، صفحہ ۱۱۔

یہ کتاب گیارہ مقالوں پر مشتمل ہے اور ہر مقالہ میں نو سے لے کر سترہ تک ابواب ہیں۔ اس کے پانچویں مقالہ کے نویں اور دسویں باب میں کرہ ارضی کے آباد حصے کی صورت پر بحث کی گئی ہے اور دنیا کی تمام آبادیوں کے طویل بلد اور عرض بلد (ریٹیٹیوڈ اور لانگیٹیوڈ) معلوم کرنے کے لیے جدولیں (ٹیبلس) مرتب کر کے شامل کی ہیں۔ یہ جدولیں جنہیں اس عہد کی جغرافیائی تحقیقات کا بہترین خلاصہ سمجھا جاسکتا ہے، جغرافیہ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ غالباً عرب جغرافیہ نویسوں میں البیرونی پہلا شخص ہے جس نے اپنے عہد کی دنیا کو طویل بلد اور عرض بلد کی جدولوں میں مکمل طور پر منضبط کیا۔ البیرونی کے بعد متعدد رصدگاہیں اسلامی ممالک میں قائم ہوئیں اور ہر رصدگاہ نے اپنی اپنی جدولیں مرتب کیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی

البیرونی کی تحقیقات سے بے نیاز نہ ہو سکا۔ چنانچہ علماً جغرافیہ میں سے ابوالفداء اور الیاقوت نے ان جدولوں سے استفادہ کیا ہے اور رصد گاہ کے علماء میں سے طوسی، الخ بیگ اور قوشچی اپنی اپنی جدولوں کی ترتیب میں ان سے مدد لینے کا اعتراف کرتے ہیں۔

یہ حقیقت بھی ہمیں پیش نظر رکھنی چاہیے کہ البیرونی کے بعد جن لوگوں نے جدولیں مرتب کیں ان کے پاس رصد گاہیں موجود تھیں اور شاہانہ فیاضیوں نے ہر طرح کا ضروری سامان مہیا کر دیا تھا۔ مثلاً الخ بیگ خود فرماں روا تھا اور علامہ قوشچی کے لیے رصد گاہ سمرقند کا تمام سرو سامان مہیا ہو گیا تھا، لیکن البیرونی کو نہ تو کوئی شاہی سرپرستی مل سکی اور نہ کوئی مکمل رصد گاہ اُس کے لیے وجود میں آسکی، اُس نے جو کچھ کیا محض اپنی شخصی جدوجہد سے کیا اور اس لیے جس درجہ اُسے کامیابی حاصل ہوئی وہ اس کی ذاتی کامیابی تھی۔

البیرونی سے ساٹھ ستر سال پہلے الادرسی نے راجہ شاہ سسلی کی فرمائش سے اپنا مشہور عالم کرہ تیار کیا تھا اور اِس کی تشریح میں "نزهتہ المشتاق" لکھی تھی۔ الادرسی کے نقشہ کو صدیوں تک اعتماد و قبولیت کی سند حاصل رہی اور سو لھویں صدی مسیحی تک یورپ کے جہازراں اور جغرافیہ نویس اُسی سے کام لیتے رہے لیکن جہاں تک جغرافیائی معلومات کا تعلق ہے الادرسی نظر و تحقیق کا وہ مقام حاصل نہ کر سکا جو ستر برس کے بعد البیرونی حاصل کرنے والا تھا۔ الادرسی ان تمام معلومات کا جو اُس کے عہد تک روشنی میں آچکی تھیں ایک محتاط ناقل تھا، لیکن محقق نہ تھا۔ رینان اُس کے البیرونی ایک محقق اور مجتہد تھا۔ اس نے محض قدامت کی تحقیقات کے نقل کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود اپنی ذاتی تحقیق و کاوش سے اس فن کو از سر نو مژدہ کر دیا۔

علاوہ بریں دونوں کی نظر و معلومات کا دائرہ بھی ایک نہ تھا۔ الادرسی کے سامنے صرف بطلموس (Ptolemy) کی دنیا تھی اور اگر اس پر نئی معلومات کا کچھ اضافہ ہوا تھا تو وہ صرف وسط افریقہ کے بعض

۱۔ سسلی کا نام بادشاہ راجستانی (Roger II) جس کے ایما پر الادرسی نے اپنے "کرہ" کی تشریح میں کتاب نزهتہ المشتاق فی اختراق الافاق لکھی تھی اور جسے کتاب ردھار اور کتاب الیوجاری بھی کہتے ہیں۔

حصوں اور مشرقی یورپ کی بعض جغرافیائی تفصیلات تھیں۔ لیکن البیرونی نے وسط ایشیا، افغانستان، چین اور ہندوستان کے بارے میں تفصیلی معلومات مہیا کیں اور ہر اہم مقام کی نسبت سائنٹفک طریقے سے جس قدر صدی تحقیقات کی جاسکتی تھیں وہ سب انجام دیں۔ ساتھ ہی ان تمام تحقیقات سے فائدہ اٹھایا جو اس کے عہد میں مغربی ایشیا کے دوسرے محققوں اور ہیئت دانوں نے اپنے اپنے دائروں میں انجام دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ البیرونی کی دنیا ہمیں الادرسی کی دنیا سے زیادہ روشن اور کھلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وہ بطیموس کی دنیا سے بہت آگے بڑھ آیا ہے اور اس کی تحقیقات کی سرحد زمانہ حال کی تحقیقات کی سرحد سے بہت زیادہ قریب ہے۔

جو مایوسی ایلٹ کے حصے میں آئی تھی وہ آگے چل کر ان تمام مشرقوں کے حصے میں آنے والی تھی جو ایلٹ کے نقش قدم پر قدم اٹھانے والے تھے۔ ایلٹ کا نسخہ اس کے تمام مخطوطات کے ساتھ برٹش میوزیم کے کتب خانہ کی حفاظت میں آگیا تھا۔ ڈاکٹر اسپرنگر (Spranger) نے اپنی کتاب

“Die Post – und Reiseäuten Des Orients.” مرتب

رتے ہوئے یہ نسخہ استعمال کیا تھا لیکن وہ بھی زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکا جن مقامات میں کتابت کی تصحیف سے مطالب ضبط ہو گئے تھے ان کی تصحیح کی کوشش میں نئی نئی غلطیاں پیدا ہو گئیں اور پھر یہ غلطیاں بعد کی مصنفات میں برابر متعاری ہوتی رہیں۔ مثلاً بدخشاں کے قریب ایک قصبہ ”و خان“ تھا جہاں سے بدخشاں کے مشہور عالم لعل نکلے تھے اور انھیں بدخشاں میں لاکر جلا دیتے تھے۔ البیرونی نے اپنی جدول میں لکھا ہے ”و خان فی حدود معاون اللعل و جلاؤہ بدخشاں“ یعنی ”و خان“ لعل کی کانوں کے حدود میں ہے جنہیں بدخشاں میں لاکر جلا دیتے ہیں۔ ایلٹ کے نسخے کے کاتب نے ”و خان“ کو ”رحال“ اور ”بدخشاں“ کو ”سدجان“ کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ذری عبارت ضبط ہو گئی اور اسپرنگر نے تصحیح کی کوشش میں یہ مطلب نکالا کہ رحال ملاوہ اور سدجان تین شہر ہیں اور عبارت کا مطلب یہ ہے کہ ”رحال، لعلوں کی کانوں کے حدود میں ہے۔ نیز شہر جلاوہ اور سدجان بھی وہیں ہیں۔ بہ میں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

اس کتاب کا ایک دوسرا نسخہ جو یورپ کے مشرقوں کے مطالعہ میں آیا وہ برلن کے کتب خانہ کا نمبر ۲۷۵ ہے۔ ڈاکٹر ای۔ وائیڈمین (E. Wiedemann) نے ایلٹ کے نسخے کے

یہ نسخہ بھی سامنے رکھا اور جدول کی تصحیح کی کوشش کی مگر یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ غور و خوض کے بعد معلوم ہوا کہ بریل کا نسخہ کام کی اصلی مشکلات کے حل میں بہت کم مدد دے سکتا ہے۔ بالآخر انھوں نے صرف اس پر قناعت کی کہ پانچویں مقالہ کے نوے باب کا ترجمہ شائع کر دیں۔ چنانچہ یہ ترجمہ شائع ہو گیا مگر اس مقام سے خالی نہیں ہے۔

ان نسخوں کے علاوہ ایک تیسرا نسخہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں بھی ہے اور غالباً سب سے زیادہ پرانا ہے۔ کیونکہ اس کی تاریخ کتابت ۱۷۵۵ء ہے۔ یعنی البیرونی کی وفات کے تقریباً ۳۵ سال بعد۔ مگر افسوس ہے کہ یہ نسخہ ناقص ہے۔ تقریباً ایک تہائی حصہ ابتدا کا اس میں نہیں ہے اور صحت کے لحاظ سے بھی بہتر نہیں۔

ہندوستان کے کتب خانوں میں بھی اس کے دو نسخے پائے گئے ہیں ایک امپیریل لائبریری کلکتہ میں ہے۔ دوسرا بمبئی کی ملٹری لائبریری میں ہے۔

امپیریل لائبریری کے نسخے کی تاریخ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ نسخہ ۱۷۶۲ء میں ایک شخص ابوالفتح نصر بن محمد بن ہبیب اللہ نے کسی دوسرے نسخے سے نقل کیا تھا۔ چنانچہ کتاب کے آخر میں یہ تصریح موجود ہے۔

” وقرخ من تسویداۃ ابوالفتح نصر بن محمد بن ہبیب اللہ فی سلخ ربیع الآخر سنة اثنی وستین وخمس مائة الموافق بر ورا بان من ماہ اسفند امر من سنة ست و خمسين مائة “

اگر البیرونی کی وفات کی وہ روایت تسلیم کر لی جائے جس سے ۱۰۲۲ء مطابق ۱۰۲۸ء میں اس کا وفات پانا ثابت ہوتا ہے تو یہ نسخہ اس کی وفات سے ایک سو پچیس برس بعد لکھا گیا تھا۔ ۱۱۱۸ء میں یہ نسخہ ایک شخص اوحد بن اسعد بن بہرام البیہقی کی ملکیت میں آیا۔ چنانچہ کتاب کے پہلے صفحے پر یہ عبارت ملتی ہے۔

” من عوامی الزمان دخل فی نوبۃ العبد الجانی انقر خلق اللہ واحوجہم الیہ اوحد بن اسعد بن بہرام المستوفی البیہقی فی شہر شعبان المعظم من شہور ثمان عشر وثمان مائة الهجرة النبویہ “

معلوم ہوتا ہے اوحد بن اسعد کے بعد یہ نسخہ مختلف شخصوں کے قبضے میں آیا

انہوں نے اپنی اپنی مہریں اس پر ثبت کیں۔ لیکن اب یہ مہریں پڑھی نہیں جاتیں کیونکہ کسی شخص نے انہیں کوشش کر کے مٹا دیا ہے۔ پھر آخری صفحے میں دو مہریں صاف صاف نمایاں ہوتی ہیں۔ ان دونوں میں ایک ہی نام درج ہے ”فاضل خاں بندہ شاہجہاں“ ان مہروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں کے عہد میں یہ نسخہ فاضل خاں کے پاس تھا۔ چونکہ اس فاضل خاں کے حالات سے ہم بے خبر نہیں ہیں اس لیے اس منزل پر پہنچ کر اس کے درود ہند کا صحیح زمانہ متعین کر لیا جاسکتا ہے۔

فاضل خاں کا نام علاء الملک توفی تھا۔ یہ شاہجہاں کے جلوس کے ساتویں سال ایران سے ہندوستان آیا اور اپنے فضل و کمال کی وجہ سے بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ ابتدا میں پان صدی منصب پر مقرر ہوا۔ پھر تمام ممالک محروسہ کی تختا ہوں کی دیوانی اور عرض مگررگی دار و عگی کے اعلیٰ عہدے تک پہنچ گیا اور جلوس کے اٹھائیسویں سال فاضل خاں کے خطاب سے لقب اور سہ ہزار کی منصب سے سرفراز ہوا۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے نامہ و پیام کی سرگذشت میں جس فاضل خاں کا نام بار بار آتا ہے وہ یہی فاضل خاں ہے۔ بعض مورخوں کا بیان ہے کہ فاضل خاں نے اپنی خوش بیانی کے زور سے اورنگ زیب کو اس پر آمادہ کر لیا تھا کہ قلعہ آگرہ میں جا کر باپ سے ملاقات کرے، لیکن شائستہ خاں اور شیخ میر کی غمازیاں مانع ہوئیں اور اورنگ زیب آمادگی ظاہر کر کے پھر پھر گیا۔ اورنگ زیب نے تخت نشینی کے بعد فاضل خاں کی قدر افزائی میں کمی نہیں کی تھی اور وزارت کے منصب پر مامور کر دیا تھا لیکن اب عمر نے بے وفائی کی۔ مسند وزارت پر بیٹھتے ہی مرض الموت میں مبتلا ہوا اور ۳۲ھ میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مرنے سے پہلے یہ شعر بار بار اس کی زبان پر طاری ہوا تھا:

امید بستہ برآمد و لے چہ فائدہ زانک

امید نیست کہ عمر گذشتہ باز آید

صاحب باثر الامراء نے اس کے حالات میں لکھا ہے کہ فنون حکمت طبیعی میں بتائے روزگار تھا خصوصاً علم ہیئت و نجوم میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ لاہور کی نہر جو علی مردان خاں کے حکم سے اس کے ایک مصاحب نے تعمیر کی تھی، مگر بعض نقایص کی وجہ سے خشک پڑی تھی، وہ اسی فاضل خاں کی حکمت و صناعتی سے جاری ہو گئی کیونکہ فن آب ترازو میں یعنی پانی کے چڑھانے کے فن میں، وہ پوری مہارت

رکھنا تھا اور جلد سوم، صفحہ ۵۲۲۔

مارٹن نے ایرانی اور مغل عہد کی تصاویر کا جو مجموعہ شایع کیا ہے اس میں

فاضل خاں کی تصویر موجود ہے جو اس عہد کے مشہور مصوّر نا اور سمرقند سے تھے۔ فاضل خاں لا ولد تھا، لیکن اس کے بعض رشتہ دار فرخ سیر کے عہد تک مختلف عہدوں پر ممتاز رہے۔ آخری منصب دار ملا ضیاء الدین تھا جس نے فرخ سیر کے عزل کے بعد انتقال کیا اور جلد سوم، صفحہ ۳۸۔ بہت ممکن ہے کہ اسی عہد میں اس کا کتب خانہ منتشر ہوا ہو۔

فاضل خاں کے خاندان کے قبضے سے نکل کر یہ کتاب مولوی صدر الدین احمد کے قبضے میں آئی۔ مولوی صدر الدین بہار ضلع بردوان (بنگال) کے رہنے والے تھے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں علوم درسیہ کی تکمیل کی تھی۔ انھوں نے بہار میں اپنے ذاتی مصارف سے ایک مدرسہ جاری کیا تھا، اور شمالی ہند کے بعض مشہور علماء کی خدمات اس کے لیے حاصل کی تھیں۔ بعض مذہبی مسائل پر ان کے رسائل کلکتہ میں چھپ چکے ہیں اور میرے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ۱۹۰۳ء میں جب لارڈ کرزن نے امپریل لائبریری قائم کی تو ان کے خاندان کے بعض ارکان نے اپنا خاندانی کتب خانہ گورنمنٹ کے حوالے کر دیا کہ لائبریری کی ایک شاخ کی صورت میں قائم رکھا جائے۔ چنانچہ اس طرح یہ نسخہ امپریل لائبریری کے قبضہ میں آ گیا۔ انسانوں کی طرح کتابوں کی زندگیوں کی کبھی سرگزشتیں ہوتی ہیں۔ آٹھ صدیوں کی جہاں نوردی کے بعد یہ کتاب اب کلکتہ کی ایک عمارت میں مقیم ہے۔

یہ نسخہ عرصے تک میرے مطالعے میں رہا ہے۔ عربی عبارت کی عام اغلاط اس میں کم ہیں، لیکن جہاں تک ہندوستانی ناموں کی تصحیف اور علمی مصطلحات و اعلام کے ضبط و تغیر کا تعلق ہے یہ نسخہ بھی یورپ کے نسخوں کی طرح ناقابل اعتماد ہے۔

پروفیسر توگان کی کامیابی | جیکہ علمی دنیا ابیرونی کی زندگی کے اس سب سے بڑے کارنامے کی تصحیح و اشاعت سے مایوس ہو چکی تھی تو اچانک ایک ایسے گوشے سے امید کی روشنی چمکی جس سے اس طرح کی خدمات کی بہت کم توقع کی جاسکتی تھی۔ یعنی استنبول کے ایک عالم۔ اے۔ زکی توگان نے جو استنبول یونیورسٹی میں ترکی تاریخ کے استاد ہیں اس کام کی انجام دہی کا ارادہ کیا اور جس راہ کے طے کرنے سے ان کے تمام پیشرو مایوس ہو چکے تھے اسے اپنی انتہا

کوششوں سے طے کر لیا۔

اس کامیابی میں پروفیسر توکان کی خوش قسمتی کو بھی بہت کچھ دخل ہے جو ان کے پیشروؤں کے حصے میں نہ آسکی۔ انھیں استنبول اور قونیہ کے قدیم کتب خانوں سے قانون کے متعدد نسخے ایسے دستیاب ہو گئے جو اس وقت تک علمی دنیائے سنہ نمایاں نہیں ہو سکے تھے۔ ان میں سے دو نسخے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ یورپ اور ہندوستان کے نسخوں سے زیادہ صحیح اور منضبط ہیں اور کام کی تمام مشکلوں کو بہت حد تک حل کر دیتے ہیں۔ ان نسخوں میں پہلا نسخہ جامع بائزید کے کتب خانہ ولایتین آفندی کا ہے۔ اس کی صحت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اس لیے تصحیح و ترتیب کے لیے اسے بنیادی نسخہ قرار دیا گیا۔

اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ استنبول اور قونیہ کے کتب خانوں کے بے شمار نوادر ہیں جو اس وقت تک منظر عام پر نہیں آسکے ہیں۔ یہ کتب خانے مختلف بادشاہوں کے وقتوں میں مساجد کے مدرسوں کے لیے وقف کیے گئے لیکن نہ تو باقاعدہ الماریوں میں کتابیں ترتیب کے ساتھ رکھی گئیں نہ کسی نے ان کی فہرست بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ اکثر کتب خانے اس حالت میں ہیں کہ ہر علم و فن کی کتابیں ایک دوسرے سے ملی جلی اوپر تلے جمع کر دی گئیں اور جا بجا ان کے ڈھیر لگ گئے۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد حکومت کے نظارت معارف و اوقاف نے اس طرف توجہ کی تھی اور ایک کمیشن مقرر کیا تھا لیکن کتابوں کی ترتیب اور فہرستوں کی تدوین کا کام پھر بھی انجام نہ پاسکا۔ اب کئی سال سے پھر یہ کام شروع کیا گیا ہے اور تمام سرکاری اور غیر سرکاری کتب خانوں کو ایک کتب خانے کی حیثیت دے کر اس کی فہرست مرتب کی جا رہی ہے اس عسرت حال کا یہ نتیجہ تھا کہ دنیا کے تمام علمی حلقے قانون کا صحیح نسخہ ڈھونڈتے رہے اور انھیں کوئی سراغ نہیں ملا حالانکہ استنبول اور قونیہ کے ڈھیروں میں ایک سے زیادہ نسخے روپوش تھے۔

پروفیسر توکان نے بجا طور پر محسوس کیا کہ اس جدول اور

جدول کے مقدمہ کی اشاعت کو پوری کتاب کی اشاعت پر موقوف نہیں رکھنا چاہئے اور اسے پہلے شائع کر دینا چاہئے۔ چنانچہ انھوں نے جدول کی تصحیح کا کام شروع کر دیا۔ اب خوش قسمتی نے ان کا اور زیادہ ساتھ دیا اور

استنبول کے کتب خانوں سے البیرنی کی تین دوسری کتابیں بھی مل گئیں۔  
 (۱) تحدید نہایات الاماکن لتصحح مسافات المساکن یعنی سائینٹک جیوگرافی  
 کے طریقوں کا بیان۔

(۲) الجماہر فی معرفتہ الجواہر جواہرات کی انواع و اقسام کی تحقیق۔

(۳) الصیدتہ۔ مفرد دواؤں کی تحقیقات۔

ان میں پہلے رسالے کا نسخہ نہایت درجہ قیمتی ہے، کیونکہ خود مصنف کے قلم کا  
 لکھا ہوا ہے۔ نسخہ کے آخر میں یہ عبارت درج ہے "وقد فرغت منہ بغزنی سبع  
 بقین من رجب سنہ ست عشر واربع مایہ یعنی ۲۲ رجب ۱۱۲۲ھ کو غزنی میں  
 میں اس رسالے کی تصدیق سے فارغ ہوا۔"

چنانچہ پروفیسر موصوف نے ان تینوں کتابوں کو بھی پیش نظر رکھا اور جس قدر  
 مواد ان میں ایسا ملا جو براہ راست یا بالواسطہ جغرافیہ عالم سے تعلق رکھتا تھا اسے  
 بھی قانون کی جدول اور اس کے مقدمے کے ساتھ شامل کر دیا۔ اس طرح ایک  
 نہایت مفید اور دلچسپ مجموعہ مرتب ہو گیا جسے انھوں نے "صفتہ المعمورہ علی البیرنی"  
 یعنی "بیرنی پیکر آف دی ورلڈ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

**طباعت کی مشکلات** پروفیسر توگان کو اس مجموعے کی اشاعت میں جن وقتوں کا  
 سامنا کرنا پڑا اور جن کی وجہ سے چودہ برس تک اس کی

اشاعت ملتوی رہی وہ بجائے خود ایک افسوس ناک داستان ہے۔ وہ ۱۹۲۷ء  
 میں جدول کی تصحیح سے خارج ہو گئے تھے اور سرکاری مطبع استنبول میں اس کی  
 چھپائی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی صرف چند صفحے چھپ سکے تھے کہ حکومت نے  
 عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف اختیار کرنے کا فیصلہ نافذ کر دیا اور عربی حروف  
 کی طباعت حکماً روک دی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری پریس نے نہ صرف کتاب کی  
 طباعت ہی روک دی بلکہ جتنے صفحات چھپ چکے تھے انھیں جلا دینا بھی ضروری  
 سمجھا۔ چونکہ اب ترکی میں اس کے چھپنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، اس لیے  
 انھوں نے روس کی اکاڈمی آف سائنس سے خط و کتابت کی اور پروفیسر برتھولڈ  
 کی طرف سے انھیں امید افزا جواب ملا تھا۔ اس خیال سے کہ اب کتاب روس میں شایع ہوگی  
 انھوں نے روسی زبان میں اس کا ترجمہ بھی شروع کر دیا تھا لیکن ابھی کام آگے نہیں بڑھا تھا کہ  
 پروفیسر برتھولڈ کا انتقال ہو گیا اور اسی طرح روسی اکاڈمی سے مدد ملنے کی توقع پوری نہ ہو سکی



توسراورل اسٹین Sir Aurel Stien کو صورت حال سے مطلع کیا۔ سیراورل کے ذریعے سے سر جان مارشل کے علم میں یہ معاملہ آیا اور انھوں نے گورنمنٹ آف انڈیا کے آرکیالاجیکل ڈپارٹمنٹ کو اس پر توجہ دلائی نہایت خوشی کی بات ہے کہ یہ آخری کوشش ناکامیاب نہ رہی اور ڈپارٹمنٹ نے اس کی طباعت کا انتظام کر دیا۔ چنانچہ اب یہ مجموعہ دہلی سے چھپ کر شائع ہو گیا ہے اور ملک کو امید دلائی گئی ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی عنقریب بہت جلد شائع کر دیا جائے گا جس کی تیاری میں آج کل پروفیسر توگان مشغول ہیں۔

اس سلسلے میں یہ حسن اتفاق بھی قابل ذکر ہے کہ البیرونی کی کتاب الہند

اور اس کا انگریزی ترجمہ انڈیا آفس لنڈن کی اعانت سے شائع ہوا تھا اور اب پچپن سال کے بعد اس کی ایک دوسری کتاب بھی گورنمنٹ آف انڈیا ہی کی اعانت سے شائع ہو رہی ہے۔

حکومت ترکی نے اس قیمتی علمی خدمت کے ساتھ جو تغافل برتا اس پر اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ استنبول یونیورسٹی کا ایک پروفیسر ساہا سال کی عرق ریزی کے بعد ایک ایسی کتاب کی تصحیح میں کامیاب ہوتا ہے جس کی تصحیح کی طرف سے یورپ کے تمام مشرقی حلقے مایوس ہو چکے تھے لیکن خود اس کے ملک کی قدروانیوں کا یہ حال ہے کہ وہ اس کی اشاعت کا بھی سروسامان نہیں کر سکتا اور اسے چودہ سال تک دوسرے ملکوں کے اہل علم سے ہم رہی واعانت کی طلب گاریاں کرنی پڑیں۔ حکومت ترکی نے حروف کی تبدیلی کا فیصلہ جن اصلاحی مقاصد کے ماتحت کیا اس کی نسبت یہاں اظہار رائے کی ضرورت نہیں ہے لیکن کوئی اصلاح کتنی ہی اہم ہو اگر اس کے غلو کو مجنونانہ انتہا تک پہنچا دیا جائے گا تو وہ اصلاح اصلاح نہیں رہے گی بجائے خود ایک افساد بن جائے گی۔ حروف کی تبدیلی کا کام بغیر اس کے بھی انجام پاسکتا تھا کہ عربی حروف ملک سے جلا وطن نہ کر دیے جاتے اور عربی کتابوں کی طباعت کو جرم نہ قرار دیا جاتا۔

القانون السعودی کی اس جدول کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ضرورتی ہے کہ معاملے کا یہ پہلو سامنے آجائے کہ البیرونی سے پہلے عربی میں فن جغرافیہ اور علم ہنیت کی وہ شاخ جسے آج کل "اسٹرانومی" اور "پریٹیکل اسٹرانومی" کے ناموں سے پکارتے ہیں کس حد تک ترقی کر چکی تھی اور جو سرمایہ پچھلی قوموں کا عربوں کو ملا تھا اس کی نوعیت کیا تھی؟ قاضی

ابن الرشد (Averroes) نے اپنی کتاب ما بعد الطبیۃ

رٹا فرانس (میں) پر پریٹیکل اسٹرانومی "کو دفن صناعت الہیۃ التجزیہ" سے تعبیر کیا ہے اور اسٹیریو اسٹرانومی "کو عرب حکماء" الہیۃ الکروی کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ یہ موضوع تفصیل طلب ہے۔ یہاں ہم صرف سرسری اشاروں پر اکتفا کریں گے۔

عربی میں ہیئت کی پہلی کتاب

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ عربوں نے منطق اور فلسفے کی طرح علم ہیئت اور جغرافیہ میں بھی تمام تر اعتماد یونانی حکیموں کی مصنفات پر کیا تھا اور اس بارے میں ان کے علم کی اصلی پونجی بطلمیوس (Ptolemy) کی کتاب الجسطی (Almagest) تھی۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ صحیح

ہے کہ المامون عباسی کے عہد میں جب بطلمیوس کی کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا تو اسے عام طور پر مقبولیت حاصل ہو گئی۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہیئت اور جغرافیہ کا جذبہ راسکول، سب سے پہلے عربی میں ترجمہ کیا گیا اور عام طور پر رائج ہوا وہ یونانی مذہب نہ تھا، ہندوستان کا مذہب تھا اور بطلمیوس کی کتاب کی مقبولیت کے بعد اگرچہ اس کا عام رواج نہیں رہا تاہم البیرونی کے عہد تک یعنی پانچویں صدی ہجری تک کافی تعداد ایسے علماء ہیئت کی موجود رہی جنہوں نے اپنے مباحث اور عملیات میں اس سے برابر کام لیا۔ چنانچہ البیرونی کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ از سر نو اس کی کتابیں سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کرے اور ابتدائی عہد کے ترجموں میں جو غلطیاں رہ گئی ہیں ان کی اصلاح ہو۔ دراصل بطلمیوس کی کتاب کی اشاعت کے بعد ہی سے عربوں میں یہ رجحان پیدا ہو گیا تھا کہ ہندی اور یونانی مذہبوں کو باہم دگر جمع کر کے دونوں کی خصوصیات سے فائدہ اٹھایا جائے اور دونوں کے نقایص جمع و تطبیق کے بعد دور کئے جائیں۔ چنانچہ تیسری اور چوتھی صدی میں متعدد کتابیں اس مقصد سے لکھی گئیں اور اسپین کے بعض حکماء تو عرصے تک اسی طریق نظر سے کام لیتے رہے۔

علم ہیئت کی سب سے پہلی کتاب جو عربی زبان میں ترجمہ ہوئی وہ ہندوستان کے مشہور فلکی اور ریاضی داں براہم گپت کی کتاب "براہم سہت سدھانت" تھی جسے اس نے ۶۲۸ مسیحی میں راجہ دیا گھر موکھ کے لیے تصنیف کیا تھا۔ البیرونی اور جمال الدین القفطی کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۰۰ھ (۱۰۰۰ء) میں سندھ کا ایک وفد ظیفہ النصور العباسی کے دربار میں آیا تھا۔ اس وفد میں ایک شخص علم ہیئت

۱۰۰۸ء اور تاریخ الحکما جمال الدین القفطی مطبوعہ لہنرک صفحہ ۲۰۰۔ القفطی نے سندھ کے وفد

کے ورود کی تاریخ ۱۰۰۸ھ لکھی ہے۔ البیرونی نے ۱۰۰۸ھ لکھا ہے۔ (آزاد)

# تذاكير ديوان الآثار القديمة بالهند

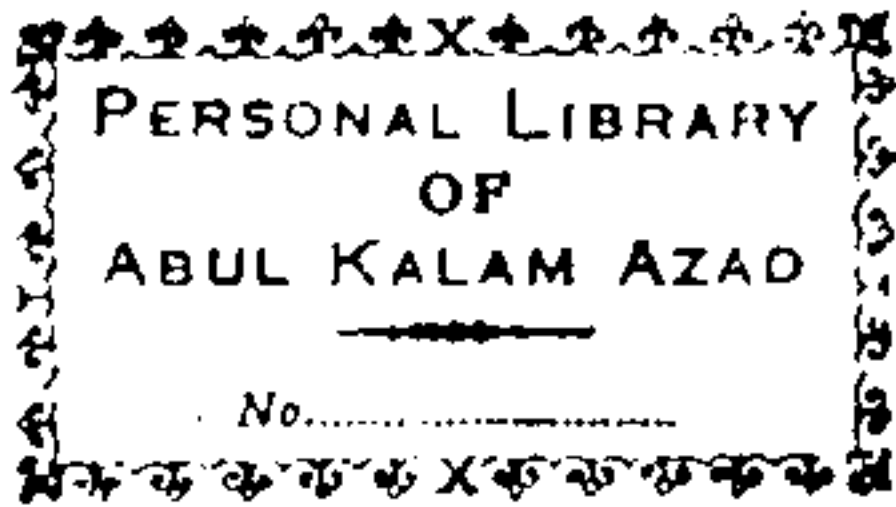
العدد ٥٢

## صفة المعمورة على البيروني

التقطها

١. زكي وليدى توغان

من «القانون السمودي» لابن الريحان محمد بن احمد الخوارزمي البيروني و قد كتبه  
أخرى له: «تحديد نهايات الأماكن لمساحات المساكن» و «الجواهر  
في معرفة الجواهر» و «الصيدنة»



کا بھی ماہر تھا۔ خلیفہ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اس نے اس شخص کی خاص طور پر قدر وانی کی اور حکم دیا کہ اس کی اعانت سے علما دربار عربی میں علم ہیئت کی ایک کتاب مرتب کریں۔ چنانچہ ابراہیم بن الجیب الفزاری نے یہ کام انجام دیا اور عربی کا پہلا زیچ مرتب ہوا۔ البیرونی اور القفطی دونوں اس بیان میں متفق ہیں کہ الفزاری کی اس کتاب نے جو فی الحقیقت براہم گیت کی کتاب سدھانت کا ترجمہ تھا عربی علم ہیئت کا سب سے پہلا مدرسہ مہیا کیا۔ اس کے بعد المامون کا زمانہ آیا۔ اس عہد میں بطلمیوس کی کتاب مجسٹک ترجمہ کی گئی۔ بطلمیوس کا طریق بحث و نظر چونکہ نسبتاً زیادہ منضبط اور اور منظم تھا اس لیے علما عرب کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی اور ہندوستانی علم ہیئت کی جگہ یونانی علم ہیئت زیادہ قبولیت حاصل کرنے لگا۔

یہی الفزاری کی کتاب ہے جو عربی میں ”سندھند“ کے نام سے مشہور ہوئی۔ ”سندھانت“ کے معنی سنسکرت میں علم و معرفت کے ہیں نیز اس کا اطلاق علم و فن کے کسی خاص مذہب اور اصول پر بھی ہوتا ہے۔ پس ”براہم سچت سندھانت“ کے معنی ہوئے علم ہیئت کا وہ مذہب جو براہم گیت کی طرف منسوب ہے۔ عربوں نے نام کا بقیہ جز حذف کر دیا اور پھر ”سدھانت“ کو جس کی مخلوط وال ان کی زبان کے لیے بہت ثقیل تھی، ”سندھند“ بنا لیا۔

البیرونی پر اس لفظ کی اصلیت مشتبہ ہو گئی تھی۔ اس کا خیال ”سدھانت“ کی طرف نہیں گیا بلکہ ایک دوسرے سنسکرت مادہ ”سدھاند“ کی طرف چلا گیا۔ ”سدھاند“ کے معنی استقامت یعنی سیدھے ہونے کے ہیں اور اسی سے پراکرت زبانوں میں ”سیدھ“ اور ”سیدھے“ کا لفظ بنا ہے۔ چنانچہ کتاب الہند میں وہ لکھتا ہے کہ عربوں میں ”سندھند“ کے نام سے جو مذہب مشہور ہوا وہ دراصل ”سدھاند“ ہے یعنی ایسی بات جس میں کسی طرح کی کجی نہ ہو (صفحہ ۷۳)۔ المسعودی جو سنسکرت سے ناواقف تھا اس سے بھی زیادہ سخت غلطی میں پڑ گیا۔ اس نے ”براہم گیت“ کے ”براہم“ کو ”برہما“ سمجھ لیا اور خیال کیا کہ چونکہ ہندو تمام علوم و فنون کی اصل کو دیوتاؤں کی طرف منسوب کر دیا کرتے ہیں اس لیے یہ علم بھی ”برہما“ کی طرف منسوب ہو گیا ہے۔ وہ اس کتاب کا صحیح زمانہ تصنیف بھی متعین نہ کر سکا۔

اجرام سماویہ کی حرکات کا ہندی حساب

## ہندوستانی کلپ کا حساب

”کلپ“ کا حساب تھا جو لاکھوں برس کا

چکر کا تھا ہے۔ اس کی بنیاد علمائے ہند کے اس خیال سے پڑی کہ تمام کوکب ایک ساتھ ملے جلے برج حمل یعنی نقطہ اعتدال ربعی میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر وہاں سے نکل کر اپنی اپنی حرکتوں کے چکر کاٹنے لگے۔ یہ چکر اس طرح چلتے رہتے ہیں کہ ہر ستارہ لاکھوں برس کا چکر کاٹ کر اپنے ابتدائی نقطہ ربعی میں واپس آتا ہے اور پھر وہاں سے نکل کر ایک نیا چکر کاٹنے لگتا ہے۔ یہ مدت جو ستاروں کے ایک چکر کاٹ کر واپس آنے کی ہے ایک ”کلپ“ قرار دی گئی ہے۔ برہم گیت کے حساب کے مطابق چار ارب بتیس کروڑ فلکی سال کا ایک ”کلپ“ ہوتا ہے۔ عربوں میں جب برہم گیت کی کتاب شایع ہوئی تو انھوں نے اس ”کلپ“ کے حساب کو سنہ سنہ ہند کے نام سے موسوم کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ البیرونی کے زمانے تک ”سنہ سنہ ہند“ علمائے فلکیات میں عام طور پر متعارف ہیں اور البیرونی اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اصل سنسکرت کا ماخذ سامنے رکھ کر از سر نو اس حساب کی تصنیف و تصحیح کرے۔

## ہندی ”یک“ اور ”مہایگ“

”کلپ“ کے طول و طویل حساب کو آسان کرنے کے لیے ایک طریقہ ”یک“ اور ”مہایگ“ کا بھی اختیار کیا گیا تھا۔ ایک ”یک“ کلپ کا ہزارواں جزو ہوتا ہے۔ یہ طریق حساب آریا بھٹ نے اپنی منمنات میں اختیار کیا جس کا زمانہ تقریباً پانچویں صدی مسیحی کا زمانہ تسلیم کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں برہم گیت کی کتاب عربی میں ترجمہ ہوئی اسی زمانے میں آریا بھٹ کا حساب بھی عربی میں منتقل ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس حساب کو عربوں نے ”سنہ ارجہر“ کے نام سے موسوم کیا۔ ”ارجہر“ آریا بھٹ کا بگڑا ہوا عربی نام ہے۔

ہندوستان میں حرکات کوکب کے ادوات کا حساب دائرہ نصف النہا

قبلہ الارض کی بنا پر کیا گیا تھا جو کرۃ ارضی کھدو آدھے آدھے ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ خط استواء لنکا یعنی سیلون پر سے گذرا ہے اور وہ نقطہ جس میں خط استواء خط نصف النہار کو کاٹتا ہے ٹھیک ٹھیک اسی جزیرہ پر واقع ہوا ہے۔ اسی لیے انھوں نے جغرافیہ کے طول بلد کا حساب لنکا سے شروع کیا

تھا۔ یہ مقام جزائر خالدا ت کے مشرقی دائرہ نصف النہار سے ۹۰ درجہ پر واقع ہے جہاں سے بطلمیوس نے اپنے اطوال کا حساب شروع کیا۔

ہندوستان کے علماء ہیئت یہ بھی خیال کرتے تھے کہ مالوا کا مشہور شہر اوجین اسی خط نصف النہار پر واقع ہے جو لنکا پر سے گزرا ہے۔ اور اسی لیے طول بلد کے حساب میں وہ اس شہر کا نام بھی اس طرح لے لیا کرتے تھے جس طرح لنکا کا لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں نے بھی اوجین کو اسی معنی میں اختیار کر لیا اور اسے "ازین" کہنے لگے۔ مثلاً وہ اپنے فلکی مباحث میں لکھتے ہیں کہ "سندھند" کے مذہب کے مطابق طول بلد کا حساب "ازین" کے خط نصف النہار سے شروع ہوتا ہے یعنی اوجین سے شروع ہوتا ہے۔ اسی لفظ "ازین" کو بعضوں نے "ارین" سمجھا اور بعض اہل لغت پر اس کی اصلیت مشتبه ہو گئی۔

خط نصف النہار جس نقطہ پر زمین کو دو ٹکڑوں میں منقسم کرتا ہے اُسے غرب علماء ہیئت نے قبتہ الارض سے تعبیر کیا ہے یعنی زمین کا درمیانی گنبد۔ چونکہ اوجین کی نسبت خیال کیا گیا تھا کہ "سدھانت" کے حساب کے مطابق طول بلد کا حساب یہیں سے شروع ہوتا ہے اس لیے اس عہد کی کتابوں میں ہمیں اس طرح کی تصریحات ملتی ہیں کہ "ازین" "سندھند" کے مطابق قبتہ الارض ہے۔ اس تعبیر نے بھی متاخرین کو جو اصلیت سے بے خبر تھے غلط فہمیوں میں ڈال دیا اور وہ دور دراز گوشوں میں نکل گئے۔

یہ خیال کہ "ازین" یا "ارین" خط استوا کا وسطی نقطہ ہے عربی علم و ادب میں یہاں تک عام ہو گیا تھا کہ رفتہ رفتہ اس لفظ نے وسط کے معنی سے بڑھ کر اعتدال کے معنی پیدا کر لئے اور اُسے اشیاء و حالات کے اعتدال کے لئے بطور ایک اصطلاح کے استعمال کرنے لگے۔ چنانچہ الشریف البحر جانی اپنی کتاب "التعریفات" میں "ارین" کا لفظ بھی لایا ہے اور اس کے معنی محل اعتدال کے بیان کئے ہیں۔ پھر مزید تشریح کرتا ہوا لکھتا ہے "یہ زمین کا وہ نقطہ ہے جہاں دونوں قطبوں کا ارتقا مساوی ہو جاتا ہے اور رات دن برابر کے ہونے لگتے ہیں، عرف میں مطلقاً محل اعتدال کے معنی میں مستعمل ہے"۔

بہر حال یونانی علم ہیئت کی اشاعت سے پہلے عربوں میں جو علم ہیئت مقبول ہوا تھا وہ ہندوستان کا علم ہیئت تھا اور کرہ ارضی کے اطوال و عرض کا حساب "سدھانت" ہی کے طریق پر کیا جاتا تھا۔ پھر جب الامون کے عہد میں بطلمیوس

کی مجبلی کا ترجمہ ہوا تو یونانی مذہب کی عام مقبولیت شروع ہو گئی اور سدھانت کا مذہب خاص خاص حلقوں میں محدود ہو کر رہ گیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بطلمیوس کا حساب ہندوستان کے حساب سے کہیں زیادہ جاثلا اور بھٹوس بنیادوں پر قائم ہوا تھا۔ اس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ اس کی کتاب کے تراکیب کی اشاعت کے بعد حکما عرب کی توجہ زیادہ تر اس کی طرف کھینچنے لگتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود الامامون کے زمانہ میں بطلمیوسی حساب مستند تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جب اس کے حکم سے کرہ ارضی کی پیمائش کا کام انجام دیا گیا تو اس غرض سے بطلمیوسی حساب ہی کا ایک درجہ چنا گیا تھا اور اسی کی پیمائش سے کرہ کی مجموعی پیمائش نکالی گئی تھی۔

تیسرے صدی جبری کا زمانہ عربی ریاضیات کی نشوونما کا اصلی زمانہ تھا۔ اسی عہد میں

## الہیۃ الکروی اور الہیۃ التجربی

علم ہیت کی یہ دونوں اہم شاخیں یعنی ”الہیۃ الکروی“ اور ”الہیۃ التجربی“ عربی میں نمایاں ہوئیں، لیکن ابھی تکمیل کا مرحلہ باقی تھا۔ چنانچہ اُس عہد کے آثار میں ان کا فقہ ان ہمیں صاحت صاحت نظر آجاتا ہے۔

عربی زبان میں دنیا کا پہلا نقشہ غالباً الامامون کے حکم سے تیار ہوا تھا۔ اس کے بعد متعدد سیاحوں اور جغرافیہ دانوں نے اپنی اپنی معلومات کے مطابق نقشے تیار کیے جن میں سے بعض دست برد زمانہ سے محفوظ رہ گئے ہیں اور آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ تمام نقشے نہایت سادہ اور ابتدائی درجے کے تھے۔ ان میں طول بلد اور عرض بلد کی تقسیم کی کوئی رعایت نہیں کی گئی تھی، صرف سات اقلیوں کی تقسیم پیش نظر رکھی گئی تھی اور بڑے بڑے شہروں کے نام ان کا تخمینہ محل تجویز کر کے لکھ دیا گیا تھا۔ چنانچہ صور الاقالیم کے جو نقشے ہمیں اب ملے ہیں وہ تمام تراسی طر پر تیار کیے گئے ہیں۔ غالباً چوتھی صدی کے اوائل سے اُس طرح کے نقشے دنیا شروع ہوئے جن کا نمونہ ہمیں الادرسی کے مشہور عالم نقشہ میں ملتا ہے۔ ان نقشوں کی ترتیب کی نوعیت بدل گئی۔ خط نصف النہار اور خط استوا کی بنیاد کی تقسیم اور طول بلد اور عرض بلد کے درجوں کا انضباط اسی وقت نظر کے ساتھ کیا جانے لگا جس طرح آجکل کے نقشوں میں کیا جاتا ہے۔ البتہ سات اقلیوں کی تقسیم جسے قدیم ہندوستانی اور ایرانی تخیل نے عربوں کے لیے مہیا کر دیا تھا اب بھی قائم رہی اور خط استوا کے شمال میں ان کے خطوط دائرہ معمورہ کو سات حصوں میں

منقسم کرتے رہے۔ اسی عہد میں عربوں کا خاص علم جغرافیہ پوری طرح تکمیل کو پہنچا اور ان کی مجتہدانہ کوششوں نے قدامت کی کوتاہیوں کی درستگی کی۔ بطلمیوس کو افریقہ اور ہندوستان کے بعض شہروں اور دریاؤں کا پورا علم نہیں ہوا تھا اور بہت سے شہر مغربی ایشیا میں نئے نئے آباد ہوئے تھے، مثلاً کونہ۔ بغداد۔ بصرہ۔ شیراز وغیرہ، ان جدولوں میں اب ہمیں یہ تمام نام ملنے لگتے ہیں اور ان کا طول بلد اور عرض بلد بھی وقت نظر کے ساتھ نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

**ہندی حساب کی بنیادی غلطیاں** یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا

بہت کی نہ تو یہ تحقیق درست تھی کہ خط استواء سیلون پر سے گزرا ہے اور نہ یہ خیال صحیح تھا کہ شہر اوجین بھی اسی خط پر واقع ہوا ہے۔ چنانچہ آجکل ہر شخص جو کسی اسکول کا چھپا ہوا معرلی نقشہ حاصل کر کے ایک نظر دیکھ لے سکتا ہے یہ غلطی فوراً معلوم کر لے گا۔ البتہ یہ بات ہمیں نہیں بھولنی چاہیے کہ ہندوستان کے قدیم فن نے جس زمانے میں ان علوم کو مدون کیا تھا اس زمانے کے وسائل علم و تجارت نہایت درجہ محدود تھے اور رصد بندی اور مشاہدات کا صحیح علم و سامان تقریباً ناپید تھا۔ ایسی حالت میں اگر چند درجوں کا فرق وہ محسوس نہ کر سکے اور خط نصف النہار اور خط استواء کا صحیح محل تقاطع ان پر مشتبہ ہو گیا تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے ان کے علمی مقام کی عزت و شان پر کوئی دھبہ لگ سکتا ہے۔ ان کی ان کوتاہیوں سے کہیں زیادہ ان کی علمی کامرانیوں ہیں۔



## ایبیرنی کا عہد اور عربی فن جغرافیہ و تخطیط

ایبیرنی کی نشوونما جو تھی صدی ہجری کے اواخر میں ہوئی اور اس کی پختہ عمر کی مصنفات پانچویں صدی میں انجام پائیں۔ اس لیے ہم اس کا عہد دونوں صدیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ اس زمانے تک عربی کا جغرافیہ اور کرہ ارضی کی تخطیط کا فن جس درجے تک پہنچ چکا تھا اس کا اندازہ حسب ذیل سطور سے کیا جاسکے گا۔

(۱) علم ہیئت کی وہ اہم شاخیں جنہیں آجکل اسفیریک اسٹرانومی اور پریکٹیکل اسٹرانومی کے نام سے پکارا جاتا ہے، عربی زبان میں ابھر چکی تھیں لیکن ان کی عملیات ابھی عام نہیں ہوئی تھیں اور علمائے فن نے ان سے زیادہ کام نہیں لیا تھا۔ (۲) جغرافیہ کی کتابیں کثرت کے ساتھ لکھی گئی تھیں اور ان میں طول بلد اور عرض بلد کی تقسیمیں مجسطی کی تصریحات کے مطابق کر دی گئیں تھیں لیکن اس کی کوشش بہت کم کی گئی تھی کہ اپنے ذاتی مشاہدات اور تجربی عملیات کے ذریعے اس فن کو از سر نو مرتب کیا جائے۔

(۳) جہاں تک جغرافیہ کی عام معلومات کا تعلق ہے عرب، افریقہ، ایشیا کو چک مغربی ایشیا، روم اور اسپین کی جغرافیائی معلومات نہایت وسعت کے ساتھ فراہم ہو گئی تھیں۔ الہمدانی نے عرب کا جغرافیہ اس تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ آج بھی اس سے زیادہ نہیں لکھا جاسکتا۔ الاصطخری نے مغربی ایشیا کی تحقیقات بڑی دقت نظر کے ساتھ کی اور گو اس کی مفصل کتاب ابھی تک ناپید ہے مگر جتنا حصہ ہمارے ہاتھ آیا ہے اس سے ہم اس کی وسعت معلومات کا اندازہ لگا سکتے ہیں، تاہم جہاں تک وسط ایشیا، ہندوستان، چین اور جزائر غرب الہند کا تعلق ہے، عرب جغرافیہ نویسوں کی تحقیقات ابھی تک مکمل نہیں ہوئی تھیں اور تحقیق و نظر کے بہت سے گوشے باقی رہ گئے تھے۔

(۴) جغرافیہ کی کتابوں میں ایک بڑا عنصر مختلف عہد کے ستیا حوں کی روایتوں کا بھی شامل ہو گیا تھا۔ ان میں ہر طرح کا رطب و یابس مواد تھا۔ علمی نقطہ خیال سے ان کی تنقیح و تحقیق کی بہت کم کوشش کی گئی تھی۔ تیسری صدی میں بحر ہند اور

بحرین کے جزیروں کی نسبت جو بے اصل اور وہم پرستانہ قصے بصرہ اور ہرمز کے بازاروں میں پھیل گئے تھے اور جن کی جھلک ہمیں الف کیلی کی سند باد کی کہانیوں اور قزوینی کی عجائب المخلوقات میں دکھائی دیتی ہے، اس طرح کے بے شمار قصے اس عہد کی جغرافیہ کی کتابوں میں بھی خلط ملط ہو گئے۔

(۵) سنسکرت سے جو علوم عربی میں ترجمہ کیے گئے وہ غلطیوں سے خالی نہ تھے اور ان کے متعدد مقامات تشریح کے محتاج تھے۔

جس طرح یونانی تراجم کی نظر ثانی ابوالنصر فارابی نے کی اور جس طرح ابن الرشد نے ارسطو کے مقالات کی شرحیں لکھ کر ان کے مطالب واضح کیے اسی طرح ہند کی علوم کی اصلاح و تہذیب کے لیے بھی ایک ابوالنصر اور ابن الرشد کی جگہ خالی رہ گئی تھی اور ابھی تک کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا تھا۔

**البیرونی کا علمی کارنامہ** | اس سلسلے میں البیرونی نے جو علمی کارنامے انجام دیے انھیں مختصراً حسب ذیل دفعات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) البیرونی نے قدام کے سہ ماہی پر از سر نو نظر ڈالی اور اس کے نقایص دور کیے۔ اس نے فن جغرافیہ کی بنیاد اسپیریٹک اور پریٹیکل اسٹرانومی کے علمی تجارب پر رکھی اور متعدد کتابیں اس موضوع پر تصنیف کیں۔

(۲) اس نے دنیا کی تمام معلومہ آبادیوں کے طول و عرض کو بحث و تحقیق کے بعد از سر نو مرتب کیا اور قدام کی غلطیوں کی اصلاح کی۔ چنانچہ القانون کے علاوہ اس کی چار اور کتابیں اسی موضوع پر ہیں: تحذیر نهایات الایاکن تہذیباً لا توالم فی تصحیح العروس والاطوال، تصحیف المنقول من العروس والاطول، تصحیح الطول والعروض المساکن المعمورہ من الارض۔

(۳) وسط ایشیا اور ہندوستان کی جغرافیائی تحقیقات کا گوشہ ابھی تک تشہ تھا۔ اُس نے اپنے ذاتی مشاہدہ و تحقیقات سے اس کی کمی پوری کی۔ ہندوستان کے بارے میں اس کی تحقیقات نہ صرف اُس عہد میں بلکہ آج بھی اپنی بے داغ نمایاں جگہ رکھتی ہے۔

(۴) اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اپنی تحقیقات کے ہر گوشہ میں وہ ایک خالص سائنٹفک معیار نظر سے ہر بات کو تولتا ہے اور کسی دوسرے غیر علمی عنصر کا اثر قبول کرنے سے قطعاً منکر ہے۔ اس نے ہر طرح کی وہم پرستیوں اور

مذہبی زودا اعتقادوں کے خیالات سے جغرافیائی معلومات کو یک قلم پاک کر دیا۔ چنانچہ القانون المسودی کے دیباچے میں اُس نے اس صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۵) ہر قوم کے علوم و فنون پر پیدائش و تکمیل کے متعدد دور گزرتے ہیں۔ پہلا دور پیدائش کا ہوتا ہے، دوسرا نشوونما کا، تیسرا بچپن اور تنقیح کا، عربی علوم کی تاریخ میں چوتھی صدی کا خاتمہ اور پانچویں صدی کا آغاز تمام علوم عربیہ کی بچپن اور تنقیح کا زمانہ تھا۔ بغداد سے لے کر اسپین تک وقت کی عام علمی روح یہی تھی۔ اسلام کے تمام دینی علوم کی بھی اسی عہد میں تکمیل و تہذیب ہوئی۔ سامانی حکومت کے ایما سے اسی عہد میں ابوالنصر الفارابی نے یونانی فلسفہ سے تراجم کی از سر نو تصحیح و تہذیب کی۔ تقریباً اس عہد کے کچھ عرصے بعد اسپین میں ابن الرشد پیدا ہوا۔ اس نے ارسطو کی مصنفات کی شرحیں لکھیں اور ان کے مطالب میں جس قدر الجھاؤ پڑ گئے تھے انھیں دور کیا۔ یہی عہد ہے جس میں ابو علی سینا یونانی طب کو منقح و تہذیب کر کے ازمنہ وسطیٰ کی درس و تدریس کے لیے اپنی کتاب القانون مہیا کر دیتا ہے۔

اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ابیرونی کی شخصیت میں اس کے عہد کی یہ علمی روح پوری طرح نمایاں ہوئی تھی اور وہ بجا طور پر الفارابی اور ابن الرشد کی صف میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔ جس طرح ان دونوں نے یونانی فلسفہ کے تراجم کی تصحیح کا کام انجام دیا تھا اسی طرح ابیرونی نے علم ہیئت اور جغرافیہ کی از سر نو تصحیح و تہذیب کی اور ہندوستانی علوم کو نئے سرے سے عربی میں مدون کیا۔

(۶) لیکن ابیرونی اس صف میں نمایاں ہونے کے ساتھ اپنی ایک خاص بلند تر جگہ بھی رکھتا ہے۔ ابوالنصر فارابی اور ابن الرشد دونوں اس زبان سے ناواقف تھے جس زبان کے فلسفہ کی تصحیح و تہذیب میں مشغول ہوئے تھے۔ انھوں نے تمام تر اعتماد عربی کے قدم تراجم پر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصحیح مکمل تصحیح نہ ہو سکی اور بعض غلط فہمیاں جو عہد تراجم کے ابتدائی دور میں پیدا ہو گئی تھیں آخر تک دور نہ ہو سکیں۔ مثلاً ابوالنصر فارابی نے الجمع بین الرائین میں ارسطو کی طرف ایک ایسا بیان منسوب کر دیا ہے جو فی الحقیقت اسکندریہ کے مذہب افلاطون جدید کے بانی پلاٹینس کا تھا۔ خود مذہب افلاطون جدید کے بارے میں عربوں کی یہ غلط فہمی برابر قائم رہی کہ وہ اسے افلاطون کا مذہب تصور کرتے رہے۔ الفارابی نے ارسطو اور افلاطون کے مذاہب میں تطبیق دینے کی جو کوشش کی وہ دراصل اپنی بنیاد ہی میں غلط تھی اور اسی غلط فہمی پر مبنی تھی۔

لیکن البیرونی نے نظر و تحقیق کی بالکل دوسری راہ اختیار کی۔ اُس نے جن علوم کو اپنا موضوع نظر قرار دیا انھیں خود ان کی اصلی زبانوں میں بڑھنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کے علوم کی اس نے جس قدر تحقیقات کی سنسکرت کی تحصیل کے بعد کی۔ فارسی، خوارزمی اور جرمانی زبانیں اُس کے لیے بمنزلہ مادری زبانوں کے تھیں۔ اس لیے قدیم ایرانی تاریخ و سنین کی تحقیقات میں اسے کسی درمیانی وسیلہ کا منت پذیر نہیں ہونا پڑا۔ جہاں تک یونانی اور سریانی زبانوں کا تعلق ہے گو کوئی براہ راست تصریح ہمیں نہیں ملتی ہے، لیکن الآثار الباقیہ میں اس نے اپنی تحقیقات کا جس پہلے میں ذکر کیا ہے اُس سے مترشح ہوتا ہے کہ غالباً وہ ان دونوں زبانوں سے ناواقف نہ تھا۔ عبرانی زبان سے اس کی ذاتی واقفیت کی تصریح خود اُس کے قلم سے نکلی ہوئی ہمیں مل گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص سنسکرت، یونانی، سریانی، فارسی اور عبرانی زبانوں سے براہ راست واقفیت رکھتا ہو اس کی علمی حیثیت کے مقالے میں الفارابی، بوعلی سینا اور ابن الکرشد وغیر ہم کو لانا کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا۔ ان اکابر کا علمی پایہ کتنا ہی بلند ہوتا ہم ان کا تمام علمی سرمایہ عربی مترجموں کے رحم پر تھا۔ وہ براہ راست نظر و تحقیق کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی کی پوری علمی تاریخ میں البیرونی کا مقام یکم منفرد نظر آتا ہے۔

الآثار الباقیہ میں ایران کی قدیم تاریخ پر بحث کرتے ہوئے وہ جن واقعات کا ذکر کرتا ہے ان کی اطلاع اُسے صرف یونانی زبان کے ماخذوں ہی کے ذریعے مل سکتی تھی۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھا کہ ایرانی بادشاہوں کی وہ داستان جو سیر ملوک الفرس کے نام سے عہد عباسی میں ترجمہ کی گئی اور جسے البیرونی کا ایک معاصر فردوسی اپنی غیر فانی نظم کا جامہ پہنارہا تھا، دراصل ایران کی تاریخ نہیں تھی۔ اس کا قومی افسانہ تھا۔ تاریخ کے لیے اُسے دوسرے ماخذوں کی طرف دیکھنا چاہیے چنانچہ وہ پارس اور ماوہ کے ہنجامنش خاندان کے واقعات سے بے خبر نہ تھا اور گورنش اعظم سے جسے یونانیوں نے سائرس اور یہودیوں نے خورس کے نام سے پکارا، پوری طرح واقف تھا۔ حالانکہ عربی کے عام مورخ جنہوں نے اس سے پہلے ایران کی تاریخیں لکھیں، اس حقیقت حال سے بے خبر تھے۔ ظاہر ہے کہ اسے ہنجامنش خاندان کے بادشاہوں کے حالات یونانی ماخذوں سے معلوم ہوئے ہوں گے کیونکہ ایران کی تاریخی داستانوں میں ہمیں ان کا

کوئی سراغ نہیں ملتا۔ البیرونی نے الآثار الباقیہ میں قدیم ایرانی بادشاہوں کے ناموں کی دو جدولیں بنائی ہیں، ایک کو وہ رومی جدول سے تعبیر کرتا ہے یعنی یونانی جدول سے، دوسری کو فارسی جدول قرار دیتا ہے۔ رومی جدول میں ان تمام بادشاہوں کے نام درج کیے ہیں جن کا سلسلہ گورکش اعظم سے شروع ہوتا ہے اور دارا یوش سوم پر ختم ہوتا ہے اور جو دراصل ایران قدیم کی واقعی ریخ ہے۔ فارسی جدول ایران کے قومی افسانہ پر مشتمل ہے۔ اس میں وہ تمام نام ہیں ملتے ہیں جو شاہنامے کے افسانوی نام ہیں۔

وہ بودھ مذہب کی قدیم تاریخ سے بھی بے خبر نہ تھا۔ وہ اُس عہد کے تمام رب مورخوں کی طرح اسے "سمنی" مذہب کے نام سے موسوم کرتا ہے جو سنسکرت کے لفظ "شمن" کی تعریب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے بودھ مذہب افغانستان میں پھیلتا ہوا ہندوکش کی دیواروں کو بھی عبور کر گیا تھا اور بامیان اور بلخ میں "سمنی" بھکشوؤں کی بڑی بڑی خانقاہیں آباد ہو گئی تھیں۔

## ہفت اقلیم

دنیا کے آباد حصہ کو سات ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کا تخیل ہندوستان اور ایران دونوں جگہ پیدا ہوا۔ گویا انڈو آریں قبائل کے تخیل نے اور بہت سی باتوں کی طرح اس بارے میں بھی ایک ہی رُخ اختیار کیا تھا، لیکن یونانیوں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے کرکے کے معمور حصہ کو تین بڑا عقلموں میں تقسیم کر دیا: یورپ، ایشیا اور افریقہ۔ چونکہ عربوں نے جغرافیہ میں زیادہ تر اعتماد بطلمیوس پر کیا تھا، اس لیے قیاس چاہتا تھا کہ وہ یونانی تقسیم کے مطابق اپنے نقشوں کو مرتب کرتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ غالباً یہ دیکھ کر کہ ہندوستان اور ایران دونوں نے سات اقلیموں کی تقسیم اختیار کی ہے، انھوں نے بھی یہی تقسیم اختیار کر لی اور ہندوستان اور ایران کے ”ہفت کشور“ کی طرح عربوں میں بھی ”اقالیم السبعہ“ کا قاعدہ رائج ہو گیا۔ البیرونی نے ”تحدید نہایات الاماکن“ میں اس موضوع پر بہ تفصیل بحث کی ہے اور اس کی یہ فصل قابل ذکر معلومات پر مشتمل ہے۔ وہ لکھتا ہے:

”قدیم ایرانی بادشاہوں کا مستقر ”ایران شہر“ تھا یعنی عراق، فارس، الجبال اور خراسان۔ انھوں نے ان ممالک کو دنیا کے آباد حصہ کے وسط میں بہ منزلہ واسطہ العقد یعنی درمیانی کڑی کے قرار دیا تھا اور باقی ممالک کو چھ دائرے بنا کر اس کے چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔ ان سات دائروں میں سے ہر دائرہ کو وہ ”کشور کہہ کر پکارتے تھے۔ ”کشور“ کے معنی قدیم فارسی میں خط کے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ یہ دائرے اس طرح ایک دوسرے سے متاز واقع ہوئے ہیں جس طرح خطوط باہم دگر متاز ہوتے ہیں۔ انھوں نے ان سات حصوں کی تقسیم سات الگ الگ دائروں کی شکل میں کی تھی اور ان کی مجموعی صورت اس طرح کی بنتی ہے۔



آج کل کرہ ارضی کی شکل اس طرح کھینچی جاتی ہے کہ شمال اوپر ہوتا ہے جنوب نیچے اور مغرب بائیں جانب لیکن قدیم نقشوں میں اس سے الٹی جہات قائم کی جاتی تھیں یعنی شمال کی جگہ جنوب کی جہت اوپر رکھی جاتی تھی، چنانچہ ان دائروں کو ترتیب دیتے ہوئے بھی جنوب کی جہت اوپر رکھی گئی ہے، اس لیے ملکوں کی جو جہتیں ہمارے دماغوں میں بسی ہوئی ہیں ان سے بالکل الٹی جگہوں میں وہ مقامات دکھائی دیتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ کرہ کی یہ تقسیم محض ایک وہی تقسیم تھی جسے کسی علمی اصل سے دور کا بھی سروکار نہ تھا۔ محض یہ بات نمایاں کرنے کے لیے کہ پارس کی مملکت معمورہ کی وسطی اور مرکزی مملکت ہے اور باقی تمام دنیا اسی کے چاروں طرف پھیلی ہے، یہ سات دائرے سات کشوروں کے نام بنائے جاتے تھے اور ہخامنش شہنشاہ ہور کے لیے مالک ہفت کشور کا لقب ڈھال لیا گیا تھا۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر سات اقلیموں کی تقسیم نے ایک علمی تقسیم کی شکل اختیار کر لی، چنانچہ عربوں کی جغرافیائی نقش آرائی میں یہ تقسیم اسی علمی تقسیم کی بنا پر نمایاں ہوتی ہے۔ اس تقسیم کی علمی بنیاد میں دو اختلافوں نے کام دیا تھا۔ سورج کے طلوع و غروب کے اوقات کا اختلاف اور موسم کا اختلاف۔ تقسیم خط استوا سے شروع ہوتی تھی اور قطب شمالی کی طرف بڑھتی ہوئی ختم ہو جاتی تھی۔ حساب کی اصل جو اس بارے میں کام کرتی تھی دن اور رات کے اوقات کا اختلاف تھا کیونکہ انسانی زندگی کے لیے سب سے زیادہ محسوس اور موثر اختلاف یہی اختلاف حال ہے۔ قدمائے پہلے یہ بات معلوم کی کہ جو خط سب سے زیادہ معتدل واقع ہوا ہے اس کے شب و روز کے گھنٹوں کی تعداد کیا ہوتی ہے۔ انھیں معلوم ہوا کہ ایسا خط اس خط پر واقع ہوا ہے جہاں سب سے زیادہ لمبا دن ساڑھے چودہ گھنٹے کا ہوتا ہے، پھر انھوں نے دیکھا کہ خط معتدل سے جو مقام باہر نکل گیا ہے وہ یا تو زیادہ ٹھنڈا ہے یا زیادہ گرم، زیادہ ٹھنڈا حصہ اس موضع سے ماورا ہے جہاں سب سے زیادہ لمبا دن سولہ گھنٹے کا ہوتا ہے اور زیادہ گرم حصہ اس موضع سے ماورا ہے جہاں سب سے زیادہ تیرہ گھنٹے کا ہوتا ہے، پس انھوں نے سات اقلیموں کی تقسیم کے لیے معتدل حصہ کو بطور مرکز کے قرار دیا اور چوتھی اقلیم ان میں بطور درمیانی واسطہ کے بن گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر دو اقلیموں کے وسطی مقامات میں آدھ گھنٹے کا فرق پڑ گیا اور اس طرح تمام اقلیمیں آدھ آدھ گھنٹے کے اختلاف اوقات سے ترتیب میں آگئیں۔ جب ان کے اداسط میں وقت کا یہ



اختلاف روزنا ہوا تو لازمی طور پر ان کے اوایل میں بھی فرق پڑا اور اوایل اور اوسط کا باہمی اختلاف پاؤ پاؤ گھنٹہ کا حساب میں آیا۔

اب اقلیموں کی تقسیم کا بنیادی حساب یہ بن گیا کہ پہلے کرہ ارضی کے معتدل ترین خطے کا تعین کیا جائے، پھر دکھیا جائے کہ ایسے مقامات کون سے ہیں جہاں طلوع و غروب کا اختلاف آدھ گھنٹہ تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر ان مقامات کو اقلیموں کا درمیانی محل قرار دے کر ان کے اوایل خطوط کو جہاں پاؤ گھنٹہ کا فرق ہونا چاہیے متعین کر لیا جائے۔

حساب کی صحت کے لیے ضروری تھا کہ دقیق اور ثوانی کے دقیق اختلافات پوری دقت نظر کے ساتھ ضبط میں آئیں اور اس کی بنگرانی کی جائے کہ ان کی وجہ سے حساب میں خفیف سے خفیف فرق بھی نہ رہ جائے۔

البیرونی کے عہد تک جتنی جدولیں اقلیموں کی تیار کی گئی تھیں ان میں طرح طرح کے باہمی اختلافات سراپا کر گئے تھے اور یہ اختلافات کئی راہوں سے آئے تھے۔

(۱) اقلیموں کے عروض کے تعین میں مشاہدہ و حساب کی غلطیاں رہ گئی تھیں، خصوصاً جیب اور ایصال (Tangents) کو مسطح کرنے اور ان کی مساحتی نوعیت کو پوری دقیقہ سنجی کے ساتھ ضبط کرنے میں جو آسان کام نہ تھا۔ علاوہ بریں کرہ کی تسطیح جسے انگریزی میں (Orthographic Projection) کہتے ہیں بجائے خود حساب کا ایک نہایت نازک معاملہ ہے اور اس کے اعمال میں اگر خفیف سی غلطی بھی رہ جائے تو حساب کا تمام انضباط فمطل ہو جاتا ہے۔ البیرونی سے پہلے کرہ کی تسطیح کے اعمال پوری طرح منع نہیں ہوئے تھے۔ مختلف حالتوں اور وقتوں کے مشاہدات کے تقایص نے مختلف نتائج پیدا کیے اور ان کے اختلافات برابر بڑھتے گئے۔

(۲) کرہ کی تخطیط کے لیے اس کے دور کو تین سو ساٹھ عروضی خطوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر خط ایک درجہ کہلاتا ہے، ہر درجے میں اوقات طلوع و غروب کا فرق آٹھ منٹ کا واقع ہوتا ہے جو پورے دور میں پہنچ کر چوبیس گھنٹے کا ہو جاتا ہے۔ یہی چوبیس گھنٹہ زمین کی حرکت دوری کا ایک مکمل چکر ہے۔ پیمائش کا طریقہ جو اختیار کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ پہلے دقیقہ سنجی کے ساتھ ایک درجہ عرضی کی مسافت معلوم کر لی جائے، پھر اسے پورے اجزائے مسافت میں ضرب دیا جائے اور اسی طرح

مجموعی مسافت کی صحیح مقدار نکال لی جائے۔  
 جس طرح حساب کی سہولت کے لیے کرہ ارضی کے عرض کو تین سو تیس ۳۶۰ ڈیگریوں میں تقسیم کیا گیا ہے اسی طرح طول کو ایک سو اسی ڈیگریوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں نو۹۰ درجے شمالی حصے کے ہیں اور نو۹۰ درجے جنوبی حصے کے اور ڈیگریوں کے ان خطوط کے تقاطع سے حد بندیوں کے خانے تشکیل ہو گئے ہیں۔ پس ایک جزو کی پیمائش اور اس کا حاصل ضرب دو اقلیموں کے اطوال کی مجموعی مسافت تک ہمیں پہنچا دیتا ہے۔

لیکن قدامت کے استخراج و حساب میں کئی وجوہ سے نقایص پیدا ہو گئے تھے اور ان کی وجہ سے نتائج میں طرح طرح کے اختلافات پڑ گئے۔ سب سے بڑا بل کرہ کی شکل کی نوعیت سے پڑا۔ کرہ ارضی کی شکل مستدیر ہے اور دونوں قطبوں کی سطح کسی قدر دبی ہوئی ہے۔ اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ اطوال کے درجے وسعت و تنگی کے اعتبار سے ایک مقدار کے نہیں ہو سکتے۔ تنوع اور تباین ناگزیر ہوا، ہم خط استواء سے شمال اور جنوب کی طرف جتنے بڑھتے جائیں گے اتنا ہی یہ فرق بھی بڑھتا جائے گا، چنانچہ موجودہ زمانہ کی پیمائش سے یہ بات مستحق ہو گئی ہے کہ اس اختلاف حال کی وجہ سے دائرہ نصف النہار کے ڈیگریوں کی مسافت میں سینکڑوں ہزاروں فٹ کا فرق واقع ہو گیا ہے۔ جو مسافت عرض البلد کے درجہ صفر یعنی خط استواء پر تین لاکھ باسٹھ ہزار سات سو چھیالیس فٹ ہوتی ہے، وہ پینتالیس کے عرض البلد پر تین لاکھ چونسٹھ ہزار چھ سو پانچ ہو گئی ہے اور پھر چالیس کے عرض البلد یعنی قطب کے اطراف میں تین لاکھ چھیالیس ہزار چار سو اکتھتر ہوتی ہے، گویا ہر تدریج کچھ کم چار ہزار فٹ کا فرق واقع ہو گیا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ جب تک کرہ کی یہ نوعیت ملحوظ رکھتے ہوئے ہر درجہ کا حقیقی فرق پوری دقیقہ سنجی کے ساتھ ضبط میں نہ لایا جائے صحیح تعداد مسافت متعین نہیں کی جاسکتی۔ قدامت کے حسابات میں چونکہ اس اختلاف حال کی نوعیت ملحوظ نہیں رکھی گئی تھی اس لیے لازمی طور پر مختلف مقامات کی عملیات نے مختلف نتائج پیدا کیے، اور رصد و مشاہدہ کے نتائج میں بھی اختلافات رونما ہو گئے۔

(۳) ایک اور سبب اختلافات کا یہ بھی ہوا کہ عرب جغرافیہ نویسوں میں سے بعض نے بطلمیوس کی طرح جزائر خالدا سے پیمائش کی ابتداء کی تھی اور بعض نے بحر محیط سے کی تھی۔ چونکہ دونوں میں اس زمانوں کا فرق ہے اس لیے یہ فرق

بھی پورے حساب میں سرایت کر گیا اور ایک جغرافیہ نویس کا حساب دوسرے جغرافیہ نویس کے حساب سے مطابقت نہ کر سکا۔

(۴) اس طرح کے رصدی حسابات میں دقیقوں اور ثانیوں کو صحت کے ساتھ معلوم کرنا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ نہایت دقیق آلات رصد کام میں لائے جائیں۔ البیرونی سے پہلے عرب علماء ان آلات کی ایجاد میں کافی ترقی کر چکے تھے اور ابو عمرو ابن الخضر الخجندی (المتوفی ۳۸۲ھ / ۹۹۲ء) نے آلہ "الفزری" کی ایجاد کر کے ثوانی (سکینڈز) کے انضباط کا عمل بہت حد تک سہل کر دیا تھا تاہم ابھی تک رصدی اعمال میں اس سے پوری طرح کام نہیں لیا گیا تھا۔ اس لیے حساب کے دقیق مراتب ضبط میں نہیں آئے تھے۔

(۵) اس کام کو صحت کے ساتھ انجام دینے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ مساحت کر دی کی تسطیح کا یعنی مجسم اجرام کو مسطح شکل دینے اور کر دی جسموں کو مستوی سطح میں بدل دینے کا طریقہ بالکل واضح ہو جائے لیکن البیرونی سے پہلے فن ریاضی کی یہ شاخ عربی میں پوری طرح رائج نہیں ہوئی تھی اور رصدی اعمال میں اس سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ اُس نے خود الآثار الباقیہ میں تصریح کی ہے کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے مجھ سے پہلے کسی شخص نے اس موضوع پر خامہ فرسائی نہیں کی۔

(۶) بطلمیوس کے جغرافیہ کی تدوین کے بعد طرح طرح کے انقلابوں سے زیادہ جاد ہوئی۔ بہت سے پورانے شہر مٹ گئے اور ان کی جگہ نئے نئے شہر آباد ہو گئے۔ بعض دریاؤں کی دھاریں نے اپنی قدیم راہیں بدل دیں اور نئی نئی راہوں پر چلنے لگے۔ اسلام کے ظہور کے بعد انقلاب حال نے ایک دوسرا ورق الٹا اور ایشیا اور افریقہ کی بہت سی آبادیاں کچھ سے کچھ ہو گئیں۔ عراق میں قدیم ایرانی شہنشاہی کا دار الحکومت ویران ہو گیا اور بصرہ، کوفہ اور بغداد کے ناموں سے نئے شہر بس گئے۔ مصر میں "منفس" کی جگہ "فساط" نے لی اور ایران میں "استخر" کی جگہ "شیراز" نے سر اٹھایا، مراکش، اسپین، وسط ایشیا اور سندھ میں بھی نئی نئی نوآبادیاں نمایاں ہوئیں اور جغرافیہ کے نقشوں میں بے شمار نئے مقامات اور نئے نام پیدا ہو گئے۔ ان آبادیوں کے جغرافیائی محل کا تعین قدیم یونانی معلومات نہیں کر سکتی تھیں اور ضروری تھا کہ نئی تحقیقات کے ذریعہ ان کے اطوال و عرض متعین کیے جائیں۔

بلاشبہ البیرونی سے پہلے ان مقامات کی نسبت تحقیق شروع ہو چکی تھی لیکن

۱۔ الفزری وہی آلہ ہے جو ازمنہ وسطیٰ میں یورپ پہنچا اور مختلف ناموں سے مشہور ہوا۔ آج کل بھی یہ استعمال میں آتا ہے اور (Sextant) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ (لازاد)

وہ مکمل نہ تھی اور رصد و مشاہدہ کے اعمال میں طرح طرح کی خامیاں رہ گئی تھیں۔ البیرونی فن جغرافیہ کے ازمندہ وسطیٰ کی تاریخ میں پہلا شخص ہے جس نے قدام کے یہ تمام نقایص صحت نظر کے ساتھ معلوم کیے اور پھر صحت رصد و مشاہدہ کے ساتھ انھیں دور کر کے جغرافیہ کو ٹھوس سائنٹفک بنیادوں پر جما دیا۔ اسے قدام سے جو کچھ ملا تھا وہ شکوک و اختلافات سے آلودہ تھا اور تخمین و قیاس کی پابندیوں سے قدم پر رُکا و ٹیس حایل ہو گئیں تھیں۔ اُس نے اپنے بعد کے زمانے کے لیے جو کچھ چھوڑا وہ نہ صرف اختلافات و شکوک کی آلودگیوں سے پاک ہو چکا تھا بلکہ تخمین و قیاسات کی پابندیوں سے بھی آزاد تھا۔ خالص عقلی نظر و استدلال اور بے میل رصد و مشاہدہ اس کی تمام جغرافیائی سرگرمیوں کا غیر متزلزل معیارِ عمل رہا اور یہی اُس کے علمی کارناموں کی اصلی خصوصیت ہے۔

چنانچہ خود البیرونی نے معاملہ کے اس پہلو کی طرف جا بجا اشارات کیے ہیں۔ القانون کے دسویں باب میں جہاں اطوال و عروض بلاد کی جدول درج کی ہے لکھتا ہے:

قد اثبت فی هذا الباب جد اول تضمنت  
اطوال البلدان وعروضها بعد الاجتهاد  
فی تصحیحها بموجب اوضاع بعضها  
من بعض وما بینهما من المسافات  
لا بالنقل الساذج من الكتب فانها  
فیها مخلطة فاسدة۔

میں اس باب میں شہروں کے طول و عرض کی جدولیں درج کرتا ہوں جو میں نے تصحیح کی پوری جدوجہد کرنے کے بعد مرتب کی ہیں۔ ان شہروں کے باہمی علاقے اور باہمگر مسافتیں پیش نظر رکھ کر یہ کام انجام دیا گیا ہے۔ میں نے محض پچھلی کتابوں سے نقل کر دینے کا طریقہ اختیار نہیں کیا کیونکہ ان کتابوں میں یہ معاملہ غلطیوں سے خلط ملط ہو گیا ہے۔

اس کتاب کے دیباچہ میں ہمیں اس طرف زیادہ اشارات واضح طور پر ملتے ہیں۔ میں اسپیریل لائبریری کلکتہ کے نسخے سے اس کا ایک حصہ یہاں نقل کر دیتا ہوں۔ یہ نسخہ عرصہ تک میرے مطالعہ میں رہا ہے۔

مجھ سے پہلے جو فضلا مجتہدین گذر چکے ہیں انہوں نے خود بھی تقلید کی راہ اختیار کی اور اپنے مطالعہ کرنے والوں کو بھی وہی

ولم اسلك فيه مسلک من تقدم مني من  
افاضل المجتهدين في حملهم من طالع  
اعمالهم واستعمل زيجاتهم على مطابقا

الترديد الى قضايا التقليد، باقتصارهم  
 على الاوضاع النرجية وتعميتهم حيرما  
 زاو لوه من عمل وطيم عنهم كيفية ما  
 اصلوه من اصل حتى احوجا المتأخر عنهم  
 في بعضها الى استئناف التعليل وفي بعضها  
 الى تكلف الانتقاد والتضليل اذ كان  
 خلد فيها كل سهو بدر منهم لسبب  
 السلاخه عن الحجه وقله اهتداء  
 ستعليها بعد هم الى الحجته وانما فعلت  
 اهو واجب على كل انسان ان يعمله في  
 صناعته من تقبل اجتهاد من تقدمه  
 بالمنة وتصحيحه خلل ان عثر عليه بلا  
 حشمة وخاصة فيما يمتنع ادراك صميم  
 الحقيقه فيه من مقادير الحركات و  
 تخليد ما يلوح له فيها، تذكرة لمن تاخر  
 عنه بالزمان واتى بعداء وقرنت بكل عمل  
 في كل باب من علله وذكروا توليت من  
 عمله ما يبعد به المتامل عن تقليدي  
 فيه ويفتخر له باب الاستصواب لما  
 اصبت فيه او الاصلاح لما زلت  
 عنه او سهوت في حساب له لان البرهان  
 من القضية قائم مقام الروح من  
 الجسد وبجملة النوعين يحصل العلم  
 بالاستيقان لاقتزان الحجته به والتبليان  
 كما يقوم بمجموع النفس والبدن  
 شخص الانسان كما ملا للعيان -

راہ دکھلائی لیکن میں نے اس کتاب  
 میں ان کا طریقہ اختیار نہیں کیا کیوں کہ  
 انہوں نے محض زراہیچوں کے اوضاع پر  
 اپنی نظر و بحث کو محدود کر دیا تھا اور جن  
 عملیات اور اصول کو خود جمع کیا تھا ان  
 کی حقیقت سے بے خبر رہے تھے۔ اس  
 صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ معاملے  
 میں طرح طرح کے الجھاؤ پڑ گئے اور بعد  
 کے آنے والوں کو حیرانیاں پیش آئیں۔  
 بعضوں نے نئی علتیں ڈھونڈیں بعضوں نے  
 رد و انتقاد میں تکلف کیا مگر اس پر بھی معاملہ  
 صاف نہیں ہوا کیونکہ دلائل کھوئے گئے  
 تھے اور غلطیوں نے ہر جگہ گھر بنا لیا تھا۔  
 میں نے اس بارے میں وہی کیا جو  
 ہر انسان کو کرنا چاہیے یعنی اپنے پیشروں  
 کی کوشش کا احسان مند ہوا لیکن ان کی  
 جن غلطیوں پر مطلع ہوا بلا تامل ان کی  
 درستگی بھی کر دی خصوصاً حرکتوں کی مقدار  
 کے مباحث میں کہ اصل حقیقت کا اس میں  
 پانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

میں نے ہر معاملے میں عمل کے ساتھ  
 اس کی علتوں کو بھی شامل کیا ہے۔ میں نے  
 ذاتی طور پر جو اعمال انجام دیے ہیں  
 ان کی حقیقت حال بھی پوری طرح واضح  
 کر دی ہے تاکہ سوچنے اور سمجھنے والے  
 اس میں غور و خوض کر سکیں اور جہاں کہیں  
 غلطی رہ گئی ہو اس کی اصلاح کر سکیں  
 برہان کی جگہ تفسیروں کے اندر ایسی ہوتی

ہے جیسی روح کی جگہ جسم میں ہے اور دونوں  
کے مجموعے ہی سے علم یقینی حاصل ہو سکتا  
ہے۔

الاثار الباقیہ میں وہ اپنی اس کتاب کا جو کردی جسموں کی تسلیح کے موضوع پر  
لکھی تھی ذکر کرتا ہے اور پھر کہتا ہے ”جہاں تک مجھے معلوم ہے مجھ سے پہلے کس نے  
اس موضوع پر خامہ فرسائی نہیں کی ہے“ (صفحہ ۳۵۷)

البیرونی کے بعد جس قدر اہم رصدی اعمال انجام دیے گئے ان کے لیے  
اس کی تحقیقات نے اصل و بنیاد کا کام دیا۔ چنانچہ اس عہد کے بعد و رصد گاہیں  
خاص طور پر مشہور ہوئیں، مراغہ کی رصد گاہ جسے ہلاکو خاں کے حکم سے نصیر الدین طوسی  
نے ۶۵۷ھ میں تعمیر کرایا تھا اور سمرقند کی رصد گاہ جو ایلیغ بیگ کے حکم سے ۸۲۰ھ یا  
اس کے قرب و جوار میں تعمیر ہوئی۔ پہلی رصد گاہ کے اعمال محقق طوسی کی زیر نگرانی انجام  
پائے اور دوسری میں ایلیغ بیگ کے علاوہ علامہ علی بن محمد قوشچی کی عملی سرگرمیاں بھی شریک  
رہیں۔ ان دونوں رصد گاہوں کی جدولوں کی تیاری میں البیرونی کی جدولوں سے بطور  
اصل و بنیاد کے کام لیا گیا۔ مراغہ کی جدول زتیج ایل خانی کے نام سے مشہور ہوئیں  
اور سمرقند کی زتیج ایلیغ بیگ کے نام سے، متاخرین اہل فن کا اعتماد زیادہ تر انہی  
زویچوں پر رہا ہے۔ چنانچہ قزوینی اور مستوفی وغیرہما جہاں کہیں اطوال و عرض کا  
ذکر کرتے ہیں تو اس سے مقصود انہی زویچوں کی مقررہ مساحیتس ہوتی ہیں۔

## اقلیموں کی مسائرو کرہ کی مجموعی مساحت

البیرونی نے اپنے اطوال کا حساب جزائر خالذات کی جگہ بحر محیط کے کنارہ سے کیا ہے اور عروض کا حساب حسب معمول خط استواء سے، ان جدولوں میں پہلی جدول سات اقلیموں کی تعداد، ساعات نہار اور جاڑے گرمی کے ارتفاعات و اطلال سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اقلیموں کے تعین کا دار و مدار اسی صورت حال کی تحقیق و تصحیح پر تھا۔ اس کے بعد دوسری جدول نمایاں ہوتی ہے جس میں اطوال و عروض کی تمام مساحتیں واضح کی گئی ہیں اور اس طرح پورے کرہ ارضی کے دور عظیم کی مساحت کا مسئلہ طے کیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ چونکہ نہایت اہم ہے اور البیرونی کی جغرافیائی تحقیقات میں اپنی ایک خاص جگہ رکھتا ہے، اس لیے بے محل نہ ہوگا اگر اس بارے میں کسی قدر تفصیل سے کام لیا جائے۔

البتہ یہ تفصیل ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھے گی کیونکہ پروفیسر ای۔ وائیڈمین (Wiedemann) نے اپنے مباحث میں جو القانون کے نوویل مقالہ کے سلسلہ میں انھوں نے لکھے تھے اس مسئلے پر بہ تفصیل بحث کر چکے ہیں اور جرنل ایشیاٹک میں بھی متعدد اہل قلم کے مقالات اس موضوع پر نکل چکے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

جہاں تک کرہ ارضی کی مجموعی مساحت کے مسئلے کا تعلق ہے البیرونی سے پہلے جس قدر تحقیقات کی گئی تھیں وہ طرح طرح کی غلطیوں سے آلودہ ہو گئی تھیں۔ متقدمین میں مساحت کا ایک اندازہ حکماء ہند کا تھا، دوسرا یونان کا، تیسرا عربوں کا جو المامون کے مشہور عالم پمایشس سے ظہور پذیر ہوا تھا۔ لیکن یہ تینوں اندازے یا تو اصلیت سے بہت زیادہ ہو گئے تھے یا بہت کم، حقیقت کے قریب کوئی نہیں پہنچ سکا تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ جغرافیہ میں البیرونی پہلا شخص ہے جس کی تحقیقات اس درجہ حتمی اور محاط ثابت ہوئیں کہ وہ قریب قریب اصلیت تک پہنچ گیا۔ آجکل ہر شخص جس نے جغرافیہ کی مبادیات کی تعلیم حاصل کی ہے جانتا ہے کہ کرہ ارضی کے دور عظیم کی مساحت چوبیس ہزار آٹھ سو اٹھاون انگریزی میل ہے۔ البیرونی نے اپنی ان جداول میں جو مجموعی مساحت نکالی ہے وہ چوبیس ہزار سات سو انہتر میل ہوتی ہے یعنی البیرونی کی مقدار

موجودہ زمانہ کی مسلمہ مقدار سے صرف نواسی میل کم ہوئی! جب البیرونی کے زمانے کے محدود وسائل تجارب و آلات کا مقابلہ موجودہ زمانے کے وسیع و عظیم وسائل علم سے کیا جاتا ہے تو بے اختیار اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اتنی بڑی اور پیچیدہ پیمائش میں صرف اتنی کمی کا رہ جانا البیرونی کے غیر معمولی فضل و کمال کا ایک تعجب انگیز علمی ثبوت ہے۔

ارسطو نے یونانی مہندسوں کی مساحت جو نقل کی ہے وہ چار لاکھ اسٹادیا ہے حکیم پسی ڈانیس (Paseidonius) نے اسے قبل مسیح میں دو لاکھ چالیس ہزار اسٹادیا نکالا تھا بطلمیوس نے الجھٹلی میں کرہ کے ایک درجہ کی جو مساحت لکھی ہے اگر اس سے پورے دور کی مجموعی مساحت نکالی جائے تو وہ ایک لاکھ اسی ہزار اسٹادیا ہوتی ہے۔

قدیم یونانی اسٹادیا (Stadia) آجکل کے چھ سو فٹ نواپنج کے برابر ہوتا ہے۔ جب اس تناسب کو پیش نظر رکھ کر اسٹادیا کی مساحت انگریزی میلوں کی تعداد میں منتقل کی جاتی ہے تو ارسطو کی مساحت پینتالیس ہزار نو سو چونسٹھ میل بنتی ہے۔ یعنی اصلیت سے تقریباً اکیس ہزار ایک سو سات میل زیادہ، پسی ڈانیس کی مساحت ستائیس ہزار پانچ سو اٹھتر میل ہوتی ہے یعنی اصلیت سے دو ہزار سات سو اکیس میل زیادہ اور بطلمیوس کے حساب کا نتیجہ بیس ہزار آٹھ سو چوراسی میل نکلتا ہے یعنی اصلیت سے تین ہزار نو سو تہتر میل کم۔

ہندوستان کے علماء فلکیات میں سے حکیم پلھس از برہم گپت کی مساحتیں البیرونی نے کتاب الہند میں نقل کی ہیں۔ وہ اس کتاب کی فصل اکیس میں جو ملکوں کے اطوال کے بارے میں ہے لکھتا ہے۔ "برہم گپت کے نزدیک زمین کا دور چار ہزار آٹھ سو یوجن ہے اور قطر ایک ہزار پانچ سو اسی" (الہند صفحہ ۱۶۰) پھر فصل ۵۵ میں جہاں کو اکب کے ابعاد پر بحث کی ہے یعقوب بن طارق کا قول نقل کیا ہے کہ اہل ہند کے نزدیک زمین کا قطر دو ہزار ایک سو فرسخ ہے اور دور چھ ہزار پانچ سو چھانوے، پھر اس قول کو رد کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ حکما ہند کا متفقہ قول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پلھس کے نزدیک زمین کا قطر سولہ سو یوجن ہے اور دور پانچ ہزار چھبیس یوجن (الہند صفحہ ۲۳۳) البیرونی نے اسی کتاب میں ہمیں بتلایا ہے کہ قدیم ہند کی یوجن (योजन) تیس سو عربی ذراع کے مساوی ہوتا ہے (الہند صفحہ ۸۰، ۲۳۲)۔ سینور کارلونا لینیو (Carlo Nallino)

۱۔ پینتالیس ہزار پانچ سو گیارہ میل ہے۔ ۲۔ بیس ہزار چھ سو تریس۔ ۳۔ ستائیس ہزار تین سو چھ۔ ۴۔ دو ہزار چار سو اڑتالیس۔ ۵۔ بیس ہزار چار سو اسی۔ ۶۔ چار ہزار تین سو اٹھتر



اور محمود پاشا فلکی مصری نے اپنے مباحث میں یہ بات صاف کر دی ہے کہ عربی میل جو چار ہزار ذراع کا ہوتا تھا تقریباً چھ ہزار چار سو تہتر انگریزی فٹ کے مساوی ہوتا ہے۔ جب اس تناسب کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم ہندی یو جن کو انگریزی میلوں کی مقدار میں منتقل کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حکیم برہم گپت کی مساحت پچاس ہزار نو سو چھتیس انگریزی میل کے برابر ہوتی ہے، یعنی اصلیت سے چھبیس ہزار اٹھتر میل زیادہ اور حکیم پلہس کی مساحت پچاس ہزار نو سو چونتیس بنتی ہے یعنی اصلیت سے چھبیس ہزار چھتر میل زیادہ۔

ہندی حکماء کا ایک مذہب وہ بھی ہے جو آریابھٹ کی طرف جسے عربوں نے ارجیہر کے نام سے یاد کیا ہے، منسوب ہے۔ یہ مندرجہ صدر حکیموں سے پہلے گزرا ہے۔ اس کے نزدیک زمین کا دور عظیم تین ہزار تین سو چونسٹھ یو جن تھا۔ انگریزی میلوں کے حساب میں یہ مقدار تینتیس ہزار ایک سو ستر ہوتی ہے یعنی اصلیت سے آٹھ ہزار تین سو انیس میل زیادہ۔

المامون عباسی کے حکم سے زمین کی پیمائش کا جو عمل دشت سنجا میں انجام پایا تھا اس کی بنا پر طے کیا گیا تھا کہ زمین کا دور عظیم پچیس ہزار گیارہ میل (انگریزی میل کے حساب سے) ہونا چاہیے۔ یہ مساحت بلاشبہ اصلیت سے قریب آٹھ تھی یعنی موجودہ زمانے کی مسئلہ مساحت سے صرف ایک سو چوں میل زیادہ تھی لیکن البیرونی نے معاملہ کو اور زیادہ اصلیت کے قریب کر دیا۔ یعنی اس کی مساحت میں زیادتی کی جگہ صرف نو اسی میلوں کی کمی رہ گئی جو اتنی بڑی مساحت میں چنداں قابل لحاظ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ عہد کی مساحت سے پہلے اگر کوئی پیمائش صحت کے ساتھ عمل میں آئی تھی تو وہ البیرونی کی شخصی پیمائش تھی۔

## قبتہ الارض اور بعض قدیم مقامات

### خط استوا اور قبتہ الارض

ہندوستان کے حکیموں میں یہ غلطی عام طور پر پھیل گئی کہ لنکا یعنی جزیرہ

سیلون (سیلان عند العرب) خط استوا پر واقع ہے اور نصف کرہ کا خط نصف النہار اسے قطع کرتا ہے نیز یہ کہ مالوا کا شہر اوجین بھی اسی خطے پر واقع ہوا ہے۔ عربی میں چونکہ فلکیات کے مباحث پہلے پہل ہندی علم ہیئت کے دروازہ سے آئے تھے اور دوسری صدی ہجری میں موسیٰ بن محمد الخوارزمی نے برہم گپت کی سدھانت (سندھ عند العرب) کے مطابق علم ہیئت کے مباحث ترتیب دیے تھے اس لیے یہ غلطی عربوں میں بھی پھیل گئی اور انھوں نے سیلون کو قبتہ الارض کے نام سے تعبیر کرنا شروع کر دیا۔ البیرونی نے اگرچہ سیلون کے قبتہ الارض ہونے میں شبہ ظاہر کیا ہے اور اس بارے میں جو توہمات ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے انھیں خرافات سے تعبیر کیا ہے تاہم حساب کی اصلی غلطی پر وہ بھی متنبہ نہ ہو سکا کیونکہ اس زمانے میں سیرو سیاحت کے وسائل اور رصدی اعمال کے طریقے اس درجہ محدود تھے کہ اس طرح کی غلطیوں کی درستگی باسانی نہیں کی جا سکتی تھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ جو سیلون (سیلان) راہہ اشوک کے زمانہ میں اس درجہ مشہور و معلوم مقام تھا کہ اس نے اپنے بھائی اور بہن کو تبلیغ مذہب کے لیے وہاں بھیجا تھا اور وہاں سے آمد و رفت کے تعلقات برقرار قائم رہے تھے، وہی سیلون چند صدیوں کے بعد ایک ایسا مجہول اور پڑا سرار مقام بن گیا کہ البیرونی کو بے حد جدوجہد کرنے پر بھی وہاں کے صحیح حالات معلوم نہ ہو سکے۔ اس نے کتاب الہند باب ۳۰ میں سیلون کی نوعیت پر بہ تفصیل بحث کی ہے اور وہ تمام معلومات جمع کر دی ہیں جو کشمیر اور پنجاب کے پنڈتوں سے وہ فراہم کر سکا تھا۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ایرانیوں اور رامائین کی کہانیاں اس طرح دماغوں پر چھا گئی تھیں کہ حقیقت کی پرچھائیں بھی کہیں پڑتی دکھائی نہیں دیتی۔

ہندوستان کے پنڈتوں کا اس وقت عام خیال یہی تھا کہ لنکا میں عفریت بستے

ہیں اور انسان کا وہاں جا کر زندہ واپس آنا بہت دشوار ہے۔  
 البیرونی کی تصریحات سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عرب تاجروں اور  
 سیاحوں کو اس وقت تک سیلون جانے اور وہاں کے حالات دیکھنے کا بہت کم موقع  
 ملا تھا۔ ان کے جہاز بحر سیلون سے گزرتے رہتے تھے۔ وہ اسے سنگدیب کے  
 نام سے پہچانتے تھے، اور بعض ساحلی مقامات سے اس کی خاص پیداوار بھی حاصل  
 کر لیتے تھے، لیکن چونکہ وہاں اترنے اور وہاں کے باشندوں سے رسمِ راہ پیدا  
 کرنے کی کوئی راہ نہیں نکلی تھی اس لیے ہندو افسانوں کا بڑا حصہ ان میں بھی پھیل گیا تھا  
 اور وہ خیال کرتے تھے کہ ہندو افسانہ کا مٹوہتہ قلعہ لنکا کے کسی حصے میں موجود ہے۔  
 البیرونی نے عرب سیاحوں کی زبانی ایک اور پُر اسرار جزیرہ کا حال نقل کیا ہے۔  
 جہاں سے وہ اپنے جہازوں پر لونگ (قرنفل) بار کیا کرتے تھے اور پھر لکھا ہے کہ عجیب  
 نہیں وہی جزیرہ لنکا ہو پھر لنکا اور لونگ کی لفظی مشابہت سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں  
 پڑ جاتا ہے کہ لونگ لنکا سے مشتق ہوا ہے حالانکہ لونگ کو لنکا سے کوئی تعلق نہیں۔  
 اس نے کتاب الہند کے اسی باب میں ہندو افسانے کے متخمد قلعہ کا جس کی کوئی اصلیت  
 نہ تھی ایک نقشہ بھی دیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہندو افسانوں میں لنکا اور سنگل دیب کو دو الگ الگ  
 مقاموں کی شکل دی گئی تھی۔ چنانچہ یہ غلط فہمی البیرونی کی تحریرات میں بھی سرایت کر گئی  
 ہے۔ اُس نے القانوں کی جدول میں لنکا اور سنگل دیب کے لیے دو مختلف درجے  
 متعین کیے ہیں جو جدول خط استوا و بلا عرض کے مقامات کی بنائی ہے، اُس میں  
 لنکا کا طول بلد ۱۰۰ لکھا ہے پھر ان مقامات کی جدول میں جو اقلیم اول اور خط استوا  
 کے درمیان واقع ہیں، سنگل دیب اور سراندیب کا ذکر کیا ہے اور اس کا طول بلد  
 ۱۲۰ اور عرض بلد ۱۰ درجہ کا لکھا ہے۔ وہ لنکا کو مجہولات میں سے قرار دیتا ہے، مگر  
 سنگل دیب کو مجہول نہیں کہتا۔ اسے بحر ہر کند کے جزائر میں شمار کرتا ہے۔ بہر حال وہ  
 اس مقام کی صحیح تحقیق نہ کر سکا۔

ان جدولوں میں ہندوستان کے

ان تمام شہروں قلعوں اور دریاؤں کے

بعض قدیم مقامات

مقامات کے اطوال و عرض منضبط کیے ہیں جن کا تذکرہ ہم کتاب الہند کے مختلف  
 ابواب میں پڑھ چکے ہیں، خصوصاً باب ۱۸، ۲۴، ۲۵ اور ۲۹ میں، ان مقامات کے  
 پرانے ناموں کو بعد کے ناموں سے تطبیق دینے کی جو کوششیں ایڈیٹ، سنماؤ،

فیرنڈ، اسٹریک اور مارکوارٹ وغیرہم نے کی تھیں وہ سب ڈاکٹر توگان کے پیش نظر تھیں اور ان سے انھوں نے اپنے حواشی میں پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ البتہ بعض مقامات ایسے تھے جن میں مزید غور و فکر کی، گنجائش باقی رہ گئی تھی۔  
ڈاکٹر توگان نے ان کی تطبیق کی بھی کوشش کی ہے۔

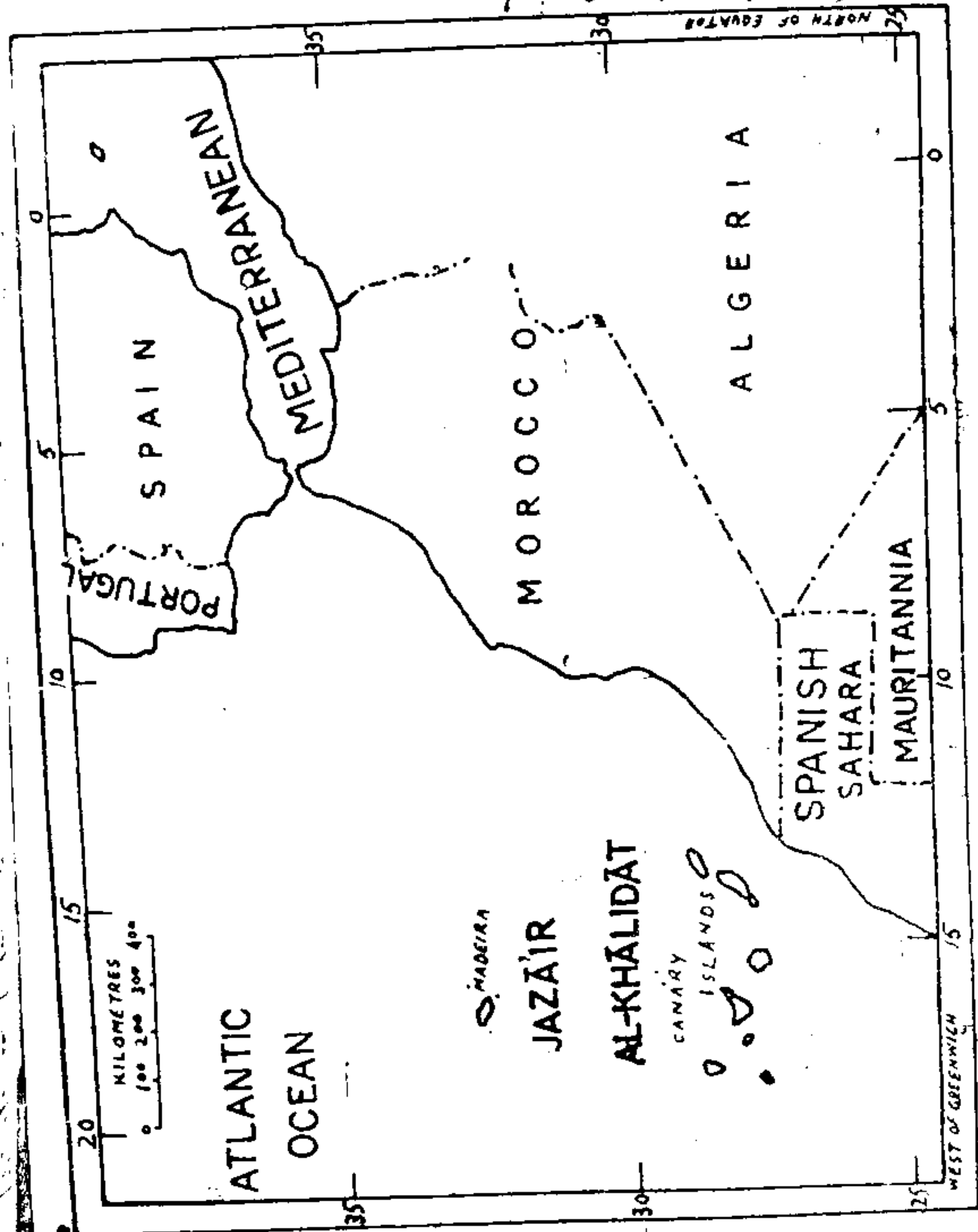
البیرونی نے تھانہ (بھٹی)، اور چیمور کو پہلی اقلیم میں درج کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہ "لاران" کی سرحد پر واقع ہے۔ "لاران" کا ذکر "ابوالفداء" اور ابن خردادبہ نے بھی کیا ہے اور مروج الذهب میں السعودی نے اسے "لاروی" کی شکل دے دی ہے۔ اس نام کی اصلیت کے بارے میں ایٹھ وغیرہ کافی بحثیں کر چکے ہیں جن کے دھرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ صاف بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ "لاران" سے مقصود موجودہ گجرات کا علاقہ ہے۔ چیمور، چول اور گنگا ساگر بھی پہلی اقلیم میں آتے ہیں "چیمور" اور "چول" کے موجودہ مقامات ایٹھ نے متعین کر دیے تھے۔

اسی اقلیم میں ۱۲۰ طول بلد پر "سنگل دیپ" کا ذکر کیا ہے اور ۱۵ عرض بلد پر جو سنگل دیپ کے عرض بلد سے پانچ درجے ہٹا ہوا ہے ایک دوسرے مقام کا نام آیا ہے۔ اور اسے سنگل دیپ کا "معبّر" بتلایا ہے، "معبّر" یعنی سنگل دیپ تک پہنچنے کا ساحلی مقام۔ لیکن یہ نام تمام نسخوں میں نقطوں کے نہ ہونے کی وجہ سے یک قلم مشتبہ ہو گیا ہے۔ یا قوت نے اسے "مند و قین" لکھا ہے اور قزوینی اسے "مند و قین" بتلایا ہے۔ جی فیرنڈ (Ferrund) نے اس پر بحث کرتے ہوئے خیال کیا تھا کہ یہ غالباً "مند و قین" ہوگا یعنی موجودہ زمانے کا مدورا۔ لیکن نقشہ میں مدورا کا جو محل ہے اسے دیکھتے ہوئے بات بنتی نہیں۔ البیرونی نے اپنی ایک دوسری کتاب الصیدنہ میں جس کا خلاصہ اس مجموعہ میں شامل کر دیا گیا ہے، اس کا نام "مندری بن" لکھا ہے اور یہی نام جدل میں بھی ہے۔ غالباً یہی نام صحت سے قریب ہے اسے موجودہ زمانے کے نقشوں کا "مندا پام" سمجھنا چاہیے یہ سیلون کے لیے معبر کا کام دے سکتا ہے۔

## البیرونی کے اطوال اور موجودہ اطوال کا ہمی فرق

یونانی جغرافیہ نویسوں کا جن میں بطلمیوس خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے یہ یال تھا کہ پچھم کی طرف خشکی کی انتہا بحر محیط یعنی اٹلانٹک کا مغربی ساحل ہے کیونکہ راظم امریکہ کی موجودگی اس وقت تک غیر معلوم تھی۔ بحر محیط کے اس حصے میں و شمالی افریقہ کے ساحل سے ٹکراتا ہے چند جزیرے واقع ہیں انھیں یونانیوں نے لیزی (Canary) کے نام سے موسوم کیا تھا اور عرب انھیں ”خالدات“ اور السعادہ“ کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ جزیرے چونکہ شمالی افریقہ کے ساحل کے غازی واقع ہوئے ہیں، اس لیے یونانیوں نے خیال کیا کہ خشکی کی آخری سرحد نہی جزیروں کو قرار دینا چاہیے چنانچہ انھوں نے انہی جزیروں کو اپنے حساب کے لیے نقطہ صفر قرار دیا اور وہیں سے طول بلد کا حساب کرنے لگے۔ عرب جغرافیہ نویسوں نے بھی ابتداء میں یہی طریقہ اختیار کیا تھا لیکن پھر بعض ائمہ فن نے خیال کیا کہ جزیروں کی جگہ شمالی افریقہ کے مغربی ساحل کو نقطہ صفر قرار دینا زیادہ سہل اور واضح ہوگا۔ چنانچہ طول بلد کے حساب کا یہ دوسرا طریقہ بھی رایج ہو گیا اور جغرافیہ کے مباحث پر جو کتابیں لکھی جانے لگیں ان میں بغیر کسی امتیاز کے دونوں طریقے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بعضوں کا حساب جزیروں سے شروع ہوتا مگر وہ چونکہ پہلے طریقے کی مساحتوں کو بھی بلا امتیاز نقل کر دیتے مگر وہ دوسرے طریقے سے بھی تعرض نہ کرتے بعضوں کا حساب ساحل بحر سے شروع ہوتا ہے مگر وہ چونکہ جزائر خالدات اور ساحل افریقہ میں دس زبانوں کا فرق ہے اس لیے یہ اختلاف اطوال کے پورے حساب میں سرایت کر گیا اور ایک ہی محل کے دو مختلف درجے کتابوں میں لکھے جانے لگے کسی حساب کا مدار جزائر کے مبداء پر تھا کسی کا ساحل کے مبداء پر اور تحقیق و امتیاز کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ البیرونی نے یہ بنیادی اختلاف محسوس کیا اور کوشش کی کہ اطوال کے حساب کے لیے صرف ایک ہی مبداء عمل اختیار کر لیا جائے۔ چنانچہ اس نے ساحل افریقہ کو مبداء قرار دے کر اپنا حساب مکمل کیا اور اسی کے مطابق تمام پرانے جغرافیہ نویسوں کے حساب کی تصحیح کی نتیجہ یہ نکلا کہ اب دو طریقوں کی جگہ صرف ایک ہی معیاری طریقہ قائم ہو گیا اور اس بنیادی اختلاف حساب کی وجہ سے جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے وہ آئندہ کے لیے دور ہو گئے۔ ازمنہ وسطیٰ کے بعد جب یورپ میں علم و فن کا چرچا از سر نو شروع ہوا

تو جغرافیائی معلومات کے لئے انھوں نے عرب جغرافیہ نویسوں کی کتابوں پر اعتماد کیا اور جہاز رانی کے لیے انہی کے بنائے ہوئے نقشے کام میں لانے لگے۔ اس میں الادرسی کا نقشہ جو اس نے راجر شاہ سسلی کی فرمائش سے تیار کیا تھا عام طور پر مشہور ہوا اور جغرافیائی مباحث کے لیے بطور بنیادی سند کے کام دینے لگا۔ الادرسی نے اطوال و عرض کے لیے بطلمیوس کا حساب اختیار کیا تھا اور بطلمیوس نے جزائر خالدات کو نقطہ صفر قرار دیا تھا، اس لیے حساب کا یہی طریقہ یورپ میں بھی رائج ہو گیا چنانچہ نشہ حدیثہ (Renaissance) کے عہد کے تمام نقشوں میں اطوال و عرض کا یہی حساب ہمیں ملتا ہے۔



لیکن اس کے بعد جب یورپ کی جغرافیائی بحث و تحقیقات کا نیا دور شروع ہو پورا نے طریقہ کی جگہ نئے طریقے رایج ہو گئے۔ اب جو نقشے بین القومی نظر و مطالعہ کے لیے بنائے جانے لگے ان میں جزیرہ فیرو (Ferro) کے خط کو نقطہ صفر قرار دیا گیا تھا جو "ڈبلیو ۲۰ آف پیرس" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا لیکن ساتھ ہی ہر ملک جہاں اس طرف بھی جانے لگا تھا کہ اپنے نقشوں میں اپنے ہی دار الحکومت یا مرکزی نگاہ کے مقام کو حساب اطوال کا بند بٹھرائیں اور کسی دوسرے بند کو تسلیم نہ کریں اس اختلاف کی وجہ سے جدید نقشوں کے لیے کوئی معیاری حساب پیدا نہ ہو سکا اور ہر ملک ساب دوسرے سے الگ ہو گیا۔ چونکہ یہ اختلاف بین القومی اتحاد علمی کو یک قلم کر دیتا تھا اس لیے ۱۸۸۴ء کی واشنگٹن کانفرنس نے اس پر بحث کی اور پھر اتفاق سے گرین وچ (Greenwich) لندن کے خط کو نقطہ صفر تسلیم کر لیا گیا۔

پنچہ اب اطوال کا حساب تمام نقشوں میں گرین وچ کے خط ہی سے شروع کیا جاتا ہے۔ گرین وچ کا یہ خط ساحل افریقہ سے مشرق کی طرف تقریباً پندرہ درجہ ہٹا ہوا ہے۔ اس لیے قدیم اطوال کے حساب سے جو افریقہ کے مغربی ساحل کو نقطہ صفر قرار دیتے تھے پندرہ درجہ کا بنیادی فرق پیدا ہو گیا ہے۔ حساب کے جزئی ایص سے جو خلل سرایت کر گیا تھا اس کے نتائج اس کے علاوہ ہیں۔ اب ریم البیرونی کے اطوال کا محل موجودہ زمانہ کے نقشوں میں معین کرنا چاہتے ہیں تو میں چاہیے کہ پہلے دونوں کے حساب کا باہمی فرق معلوم کر لیں جب یہ فرق ہم ہندوستان کے مقامات کے لیے نکالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ البیرونی کے اطوال اور موجودہ زمانے کے نقشوں کے اطوال میں تقریباً ۲۶ درجوں کا فرق پڑ گیا ہے یعنی موجودہ نقشوں کے درجے پر اگر ۲۶ یا ۲۷ کا اضافہ کریں تو البیرونی کے اطوال کے درجے تقریباً نکل آتے ہیں۔ ہم یہاں بطور مثال کے چند شہروں کے درجے و نون نقشوں کے درجے کرتے ہیں جن سے یہ فرق واضح ہو جائے گا۔

شہر	موجودہ طول بلد	البیرونی کا طول بلد
کابل	۶۹	۹۵ - ۲۰
پشاور	۷۱ - ۵۰	۹۷ - ۱۰
بزندرابن (مہرا)	۷۷ - ۴۴	۱۰۴

۱۰۴ - ۱۰۳ = ۱ ہے ایک میں ایک سو چار ۱۰۴ ہے ایک میں ایک سو تین ۱۰۳ (آزاد)

۵۰ - ۱۰۰	۵۲ - ۷۵	اوجین
۱۰۴	۵۸ - ۷۹	قنوج
۱۰ - ۱۰۴	۴ - ۷۸	قلعہ گوالیار
۱۱۰	۸۴	نیپال
۲۰ - ۱۰۷	۵۵ - ۸۱	پریاگ (والہ آباد)

جہاں تک عروض بلا د کا تعلق ہے چونکہ اطوال بلا د کی طرح کوئی بنیادی اختلاف اس میں غرض نہیں ہو اس لیے موجودہ زمانہ کے مقررہ عروض سے اگر البیرونی کے عروض مختلف ہیں لیکن بہت زیادہ فرق نمایاں نہیں ہے۔ مثال کے ہم بعض مقامات کا مقابلہ کرتے ہیں۔

شہر	موجودہ زمانہ کا عرض بلد	البیرونی کا عرض بلد
کابل	۳۵ - ۳۴	۲۵ - ۳۳
پشاور	۱ - ۳۴	۱۵ - ۳۳
ملتان	۵۲ - ۳۰	۲۸
بندرا بن (متھرا)	۳۳ - ۲۷	۲۷
اوجین	۱۱ - ۲۳	۲۴
قنوج	۳ - ۲۷	۲۵ - ۲۶
پریاگ (والہ آباد)	۲۶ - ۲۵	۲۵
تھانہ (بیبئی)	۲۴ - ۲۱	۲۰ - ۱۹
بنارس	۱۸ - ۲۵	۱۵ - ۲۶

اس موقع پر یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ البیرونی کو ہندوستان اندرونی حصوں کی سیر و سیاحت کا اور وہاں رصدی اعمال انجام دینے کا موقع نہیں تھا۔ اس نے اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ تمام تر پنڈتوں اور سیاحوں روایتوں پر مبنی ہے یا ان بیانات پر جو ہندوستان کے بعض مشہور شہروں کے متعلق یونانیوں اور عربوں کی مصنفات میں درج ہو چکے تھے۔ وہ خود کتاب التہذیب میں

لہ القانون کے نسخوں میں اختلاف ہے۔ کتب خانہ ولایتین جا راللہ آفندی کے نسخے میں یہی عدد ہے، لیکن ایک دوسرے نسخے میں ۱۰۶ ہے، پر دنیس توکان نے دوسرے نسخے پر اعتماد کر ہے۔ (آزاد)



لکھتا ہے۔

” میں نے قلعہ لاہور کا عرض بلد رصدی عمل کے ذریعے معلوم کیا تو وہ ۳۴ درجہ اور ۳ دقیقہ کا نکلا۔ لاہور کے علاوہ جن دوسرے شہروں کا عرض بلد میں دریافت کر سکا ہوں ان کے نام یہ ہیں۔ غزنی۔ کابل۔ کندی۔ رباط الامیر۔ ذہبور (یعنی موجودہ زمانہ کا جلال آباد)۔ لغمان۔ پراشاور (پشاور)۔ وے ہند (راٹک)۔ جیلیم (جہلم)۔ قلعہ نندنہ (ٹلا)۔ ملتان۔ سیالکوٹ۔ مندگور۔ ان مقامات سے ہم آگے نہ بڑھ سکے اور نہ ہندوؤں کی کتابوں سے ہمیں شہروں کے اطوال و عرض کا کچھ پتہ ملا۔“ (الہند، صفحہ ۱۰۲)۔

ظاہر ہے کہ پنجاب کے ان شہروں کے علاوہ اور تمام مقامات کے عرض و اطوال جو اُس نے مرتب کیے ہیں وہ ذاتی رصد و مشاہدہ کا نتیجہ نہیں ہو سکتے۔ محض تخمین و قیاس سے معین کیے گئے ہیں، بلاشبہ اس کے سائنٹفک دماغ نے روایتوں کی جانچ پڑتال میں کمی نہیں کی ہوگی لیکن معاملے کی نوعیت ایسی تھی کہ بغیر ذاتی رصد و مشاہدہ کے حقیقت حال کا علم حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کتاب الہند میں خود کہتا ہے کہ ہندوستان کے راویوں اور ستیا جوں کے بیانات سے حقیقت حال کا علم حاصل کرنا نہایت درجہ دشوار ہے۔ اُن کے بیانات طرح کی غلط فہمیوں، وہم پرستیوں اور مبالغہ آرائیوں میں ڈوبے ہوتے ہیں اور سامع کے لیے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ روایت کا کتنا حصہ اوہام و خرافات پر مبنی ہے اور کتنا حقائق نفس الامری پر؟

ایک بڑی دشواری اُسے یہ پیش آئی کہ ہندوستان کے شہروں کی باہمی نسبت کی نسبت راویوں کے بیانات بے حد مختلف تھے اور جمع و تطبیق کا کوئی قابل ثوق ذریعہ موجود نہ تھا۔ وہ اس سلسلے میں بطلیموس کا بھی ذکر کرتا ہے کہ ایسی دشواری اُسے بھی پیش آئی ہوگی۔ (کتاب الہند، صفحہ ۹۷)۔

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ طرح طرح کی غلطیاں حساب میں سرایت کر جائیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی غیر معمولی کوشش و احتیاط بھی اُسے صورت حال کے قدرتی نقایص سے نہ بچا سکی اور مساحت کے اندازوں میں غلطیاں واقع ہو گئیں۔ مثلاً موجودہ پٹنہ تقریباً اسی محل پر واقع ہے جہاں قدیم عہد کا پاٹلی پتر آباد تھا۔ پٹنہ کا طول بلد ۵۸-۱۲ اور عرض بلد ۲۵-۳۷ ہے۔ ابیرونی پاٹلی پتر کا

طول بلد ۱۰۸۔۲۰ لکھتا ہے اور عرض بلد ۳۲۔۳۰۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس بائیں  
 میں جو روایتیں اُس تک پہنچی تھیں وہ اصلیت کو صحت کے ساتھ واضح نہیں کرتی  
 تھیں۔ اس نے بنارس سے پانلی پتر تک کا فاصلہ بین فرسخ عربی قرار دیا ہے اور  
 بنارس سے اُسے پورب میں بٹا ہوا تصور کیا ہے، حالانکہ یہ دونوں باتیں صحت  
 سے دور ہیں۔ ایسا ہی فرق گنگا ساگر کے محل وقوع میں بھی پڑ گیا کیونکہ صحیح فاصلہ  
 اور صحیح جہت اس کے علم میں نہ آسکی۔

## اس عہد کی جغرافیائی تحقیقات کی بعض خصوصیتیں

البریونی نے اپنی کتابوں میں جا بجا اپنی رصدی عملیات کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُس کے ذوقِ تحقیق کا کیا حال تھا؟ اور ایک سچے عالم اور محقق کی روح کس طرح اس کی شخصیت کے اندر کام کرتی رہتی تھی؟ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اُس نے اپنی ذاتی رصد و مشاہدہ سے کس طرح قدمار کی غلطیوں کی اصلاح کی۔ تحدیدِ نہایات الاماکن میں جس کے اہم مباحث ڈاکٹر توکان نے اس مجموعے میں شامل کر دیئے ہیں، لکھتا ہے۔

”میں نے دو مرتبہ جرجانیہ (گرگانج) کے عرض بلد کی رصدی اعمال کے ذریعے تحقیقات کی پہلی مرتبہ دریائے جیجون کے مغربی حصے میں جو جرجان اور خوارزم کے درمیان واقع ہے، بوشکانر نامی گائوں کے اندر کی۔ اس گائوں کا عرض ۴۱-۲۶ تھا اور یہ واقعہ ۳۸۴ھ کا ہے۔ دوسری مرتبہ ۳۸۴ھ میں مجھے اس عمل کا خود شہر جرجانیہ میں موقع ملا اور مشاہدہ و عمل کے بعد یہ بات محقق ہو گئی کہ اس کا صحیح عرض بلد ۴۲-۱۷ ہے“ (مصنفہ المعمرہ، صفحہ ۵۸)۔

ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے:

”میں نے ۳۸۵ھ میں کرہ ارضی کے میل اعظم کی رصدی تحقیقات قریہ بوشکانر میں کی تھی جو خوارزم کے پہاڑوں کے اندر جیجون کے مغرب میں واقع ہے۔ میں نے قریہ بوشکانر کا عرض بلد ۴۲-۲۶ پایا اور اس قریہ اور جرجانیہ کی باہمی مسافت ۱۰ فرسخ تھی جسے میل کے حساب سے ۵۱ میل تصور کرنا چاہیے۔“

پھر ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے:

”خوارزم کا عرض بلد ۴۱-۳۵ ہے اور یہ اعداد اس رصدی عملیہ کے مطابق ہیں جو میں نے اوایل عمر میں کیا تھا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ واقعہ ۳۸۵ھ یا اس کے قریبی زمانے کا ہے“ (ایضاً صفحہ ۵۹)۔

ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے:

”جرجانیہ کے دارالامارت میں مجھے موقع ملا کہ نصف النہار کے ارتفاع  
 کا رصدی عمل انجام دوں۔ ۱۱ ربیع الآخر ۱۳۲۵ھ مطابق ماہ مہر ۱۳۵۵ یزدجردی  
 اور ۱۱ ایلول ۱۳۲۵ھ اسکندریہ کو میں نے اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ قمریہ ہے اور  
 وہ جرجانیہ کے تمام عرض سے جو مَرَج ہے زیادہ ہے اور میں نے اپنی کتاب التقریب  
 الی تحقیق حرکت الشمس میں اس رصدی عمل کو سورج کی درمیانی حرکت کی معرفت  
 کے لیے بطور اصل کے قرار دیا ہے“ (ایضاً صفحہ ۶۰)

ایک اور موقع پر لکھتا ہے:-

”ابو علی الحسین بن عبداللہ ابن سینا کا ایک مکتوب میری نظر سے گزرا جو  
 اس نے جرجان کے طول بلد کی تصحیح کی نسبت زرتیں کیس بنیت  
 شمس المعالی کو لکھا تھا۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ مجھے اس کا حکم دیا گیا  
 لیکن حالات ایسے تھے کہ نہ تو ان مقامات کی مناسبت سے نتیجہ نکالا  
 جاسکتا تھا جن کا طول بلد معلوم تھا اور نہ اس سال ایسا چاند گہن  
 ہوا تھا کہ فلک النہار میں چاند کے ارتفاع کی جہت سے رصدی عمل  
 انجام دیا جاسکتا۔ بہر حال اس نے رصدی عمل سے نتیجہ نکالنے کی  
 کوشش کی تو طول بلد ف و نکلا“ پھر اس کے بعد اس طریقے کی  
 تشریح کی ہے جو ابو علی سینا نے اختیار کیا تھا اور آخر میں لکھتا ہے  
 کہ ”بو علی باوجود اپنی ذکاوت اور فطنت کے اپنے اس طریقے کے نتیجے  
 پر پورا وثوق نہیں رکھتا تھا حالانکہ احتیاج اسی وثوق کی تھی“ بلکہ  
 ایک دوسرے موقع پر بلخ کی نسبت لکھتا ہے:

”۲۴۵ھ مطابق ۱۳۲۵ھ یزدجردی سلیمان بن عصمتہ سمرقندی نے بلخ  
 میں رصدی عمل انجام دیا تھا۔ . . . . . منصور بن طلحہ کی نسبت بھی بیان کیا گیا ہے  
 کہ اس نے رصدی عمل سے بلخ کے طول بلد کا رصدی عمل انجام دیا۔ یہ فاضل شخص  
 خراسان کے ولایہ طاہریہ کی یادگار تھا اور علوم ریاضی اور اس کے متعلقہ علوم  
 میں بڑی دلچسپی رکھتا تھا“ (ایضاً صفحہ ۶۷)

نیشاپور کی نسبت لکھتا ہے:

نیشاپور کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ منصور بن طلحہ طاہری نے اس کا عرض بلد

تو ہی پایا تھا اور ابوالعباس ابن حمدون نے بیان کیا ہے کہ اُس نے متعدد چاند سورج کے گہنوں کے موقعوں پر بغداد اور نیشاپور کے درمیان رصدی عمل انجام دیا تو معلوم ہوا کہ طول بلدیب ل ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ یہ بات محمد بن علی مکی کی کتاب استدارة السماء والارض میں مذکور ہے۔ "ایضاً صفحہ ۶۷"

موجودہ زمانے میں جب آمد و رفت اور خبر رسانی کے نئے وسائل نے کرہ ارضی کے دور دراز گوشوں کو بھی ایک دوسرے سے اس درجہ قریب کر دیا ہے کہ مہینوں کی مسافت گھنٹوں کے اندر طے کی جا سکتی ہے، رصد اور مشاہدات کے تمام بڑے بڑے اعمال دنیا کی مختلف رصدگاہوں کے باہمی اشتراک عملی کے ساتھ انجام دیے جاتے ہیں اور ایک ہی موقع اور حادثہ کا مختلف مقامات سے بہ یک وقت مطالعہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سورج اور چاند کے گہن کے موقع پر اکثر ایسا کیا گیا ہے کہ یورپ اور ایشیا کے مختلف مقامات میں پہلے سے ارساد و حساب کا انتظام کر لیا گیا اور ایک مقام کے مشاہدہ و حساب کے نتائج فوراً تار برقی کے ذریعہ دوسرے مقامات پر پہنچا دیے گئے۔ اب تار برقی کے ذریعے کی بھی احتیاج باقی نہیں رہی کیونکہ لاسٹکی کے ذریعہ تمام رصدگاہیں ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئی ہیں لیکن لوگوں کو یہ معلوم کر کے تعجب ہو گا کہ چوتھی صدی ہجری یعنی نہارویں صدی عیسوی میں جب موجودہ زمانہ کے وسائل سفر و منجاہ سے دنیا یک قلم محروم تھی بعینہ یہی طریق کار عملاً فن میں رائج ہو گیا تھا اور مہینوں اور برسوں کی مسافتیں بھی ان کے باہمی اشتراک عمل میں خارج نہیں ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ البیرونی اس کتاب میں لکھتا ہے "میں نے اور ابوالوفاء محمد بن محمد البوزجانی نے ۳۸۷ھ (مطابق ۹۹۸ء) میں باہم دگر مل کر چاند گرہن کا رصدی عمل انجام دیا۔ میں خوارزم میں تھا، ابوالوفاء بغداد میں تھا۔ ان دونوں مقامات کے اعمال کے نتائج دونوں جگہوں کے خطوط نصف النہار کے قدرتی اختلاف کے ٹھیک مطابق ظہور میں آئے۔ اسی طرح میں نے کسی بار چاند گرہن کے موقع پر ارساد کیا اور ہر مرتبہ ایک ہی مقدار ثابت ہوئی اگر کچھ فرق نکلا بھی تو اتنا کم کہ مقدار کی پکڑ میں نہیں آسکتا" (ایضاً صفحہ ۵۹) اس طرح کے مشترک رصدی تجارب کے بعض دوسرے مواقع بھی البیرونی نے نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ صدر واقعہ کوئی خاص مستثنیٰ واقعہ نہ تھا علاوہ بریں بعض دیگر ائمہ فن کی نسبت بھی ایسے ہی تجارب منقول ہیں مگر ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

البیرونی نے اپنی عملی جدوجہد ہر طرح کے موافق و مخالف حالات میں یکساں عزم و ہمت کے ساتھ جاری رکھی اور وقت کا کوئی ہنگامہ اس کے ذوق تحقیق کی طلب گاریوں پر غالب نہ آسکا وہ اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے۔

” میں نے ۳۵۰ھ میں رصد کرنے کا پورا تہیہ کر لیا تھا اور اس غرض سے قطر کا ایک دائرہ پندرہ ہاتھ کا نسیار کرایا تھا نیز ان تمام آلات کا بھی انتظام کر لیا تھا جو اس کے ساتھ مطلوب ہوتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ مجھے زیادہ مہلت نہ مل سکی میں زیادہ سے زیادہ صرف یہ کر سکا کہ شہر خوارزم کے جنوب کے ایک گاؤں میں ارتفاع کی غایت کا اوزیر اس ارتفاع کا جس کی سمت متعین نہیں ہوتی رصدی عمل انجام دے دوں جس دن اس عمل میں مشغول تھا سوائے اتفاق سے اسی دن خوارزم کے دو امیروں میں باہدگر معرکہ آرائی پیش آئی۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرا کام اچانک معطل ہو گیا۔ مجھے اک دوسری جگہ پناہ لینا پڑی۔ پھر وطن کے ترک کرنے پر مجبور ہو گیا اور اس کے بعد برسوں تک سکون خاطر نصیب نہیں ہوا۔“ (صفحہ ۵۹)

البیرونی نے مندرجہ صدر بیان میں خوارزم کے جس ہنگامہ کا ذکر کیا ہے اس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔ اس عہد میں یہ علاقہ دو امیروں میں بٹا ہوا تھا ایک حصہ مامون بن محمد کے قبضہ میں تھا جس کا دارالحکومت جرجانیہ یعنی گرگانج تھا، دوسرا حصہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد خوارزم شاہ کے قبضے میں تھا جس کا دارالحکومت کاش تھا۔

رمضان ۳۸۵ھ مطابق ۹۹۵ء میں امیر مامون نے کاش پر چڑھائی کی اور ابو عبد اللہ کو قتل کر کے اس کا علاقہ اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ ابو عبد اللہ کا خاندان آل عراق کہلاتا تھا اور البیرونی کا سرپرست تھا۔ اسی خاندان کا ایک رکن ابو النصر منصور بن علی تھا جس کی نسبت البیرونی نے اپنے ایک قصیدہ میں تصریح کی ہے کہ اس کی سرپرستیوں سے میری علمی زندگی کی بنیادیں استوار ہوئیں۔

قال عراق قد عذونی بدرهم  
ومنصور منهم قد تولى عناسيا

یعنی آل عراق نے اپنی فیاضیوں سے مجھے نشوونما دی اور انہی میں منصور تھا جس نے میری زندگی کی بنیادیں استوار کر دیں۔

جس وقت خوارزم کی سرزمین قتل و نہب کا یہ کھیل کھیل رہی تھی البیرونی اس کی آبادیوں سے باہر ایک گاؤں کے میدان میں اپنی رصد بندیوں کے پُر سکون اعمال میں مشغول تھا جس دن امیر مامون نے کاش کے شاہی محل میں ابو عبد اللہ کو گرفتار کیا

اُسی دن البیرونی نے اپنی رصد گاہ کو ایک نئے دائرہ قطر اور اس کے متعلقہ آلات سے آراستہ کیا تھا اور زمانے سے صرف اتنی مہلت کا آرزو مند تھا کہ اسے اپنے رصدی عملیہ کے نتائج قلم بند کرنے کا موقع مل جائے: وما احسن ما قبل بالفارسیہ:

نہ گویم اسے فلک کز کجروی ہایت تو برگرودی

شب وصل ست، خواہم این قدر آہستہ تر گردی

راے آسمان! میں یہ نہیں کہتا کہ تو اپنے ظلم و ستم سے باز آ جا میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آج وصل کی رات ہے۔ ذرا آہستہ چال سے چل کہ صبح جلد نہ طلوع ہو جائے! لیکن افسوس ہے زمانہ کے بے رحم انقلابات نے اُسے اتنی مہلت بھی نہ دی

ابوالعباس مامون کے عہد میں آل عراق کی سی سرپرستیاں البیرونی کو نہیں مل سکتی تھیں تاہم اُسے اپنے علمی اشتغال کے جاری رکھنے کا موقع مل گیا تھا لیکن اس کے بعد پھر دوسرا انقلاب پہلے سے بھی زیادہ سخت ہوا، یعنی ۸۰۰ھ مطابق ۱۰۱۵ء میں محمود غزنوی نے خوارزم پر حملہ کر دیا اور مامونیوں کا خاندان حکومت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اب البیرونی کی زندگی غزنی کے دربار سے وابستہ ہو گئی تھی لیکن یہی زمانہ اس کی زندگی کا ایسا زمانہ ہے جسے تاریخ کی نگاہیں ابھی تک علم و تفصیل کے ساتھ نہیں دیکھ سکی ہیں۔

غزنی کے متعلق اس کتاب میں لکھتا ہے:

”ان واقعات کے بعد پھر ایسا اتفاق پیش آیا کہ میں نے غزنہ (غزنی) میں غایت ارتفاع کا رصدی عمل انقلاب صیفی کے زمانے میں انجام دیا۔۔۔ میں نے انقلاب شتوی کے نصف النہار کا ارتفاع ۳۸°۳۸' نیز و گردی میں ۳۲° - جزو اول و جزو، کا چھٹا حصہ پایا جس میں اعظم ۳۸ - ۳۵ ہونا چاہیے۔ غزنہ کا عرض ۳۸ - ۳۵ ہے“ (صفحہ ۵۹)

## محمود غزنوی اور البیرونی

البیرونی کی زندگی کا آخری زمانہ غزنی میں گزرا۔ اس نے ہندوستان کی حیثیت اسی عہد میں کی اور ہندوستان کے علوم پر تمام کتابیں اسی عہد میں لکھیں۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی سے اس کے تعلقات کی نوعیت کیسی تھی؟ سلطان نے اس کی علمی زندگی کی سرپرستی کی تھی یا اس کی طرف سے بے پروا رہا تھا، یا پھر دونوں کے باہمی تعلق میں اس سے بھی زیادہ کوئی بات کام کرتی رہی تھی؟

کتاب الہند میں ایک جگہ اپنے قیام ہند کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے البیرونی نے بعض اشارات ایسے کیے ہیں جن سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ ہندوستان میں اپنی طلب اور مرضی کے مطابق کام نہیں کر سکتا تھا اور اس پر کچھ پابندیاں عاید کر دی گئی تھیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتا ہے:

فہذا صورة الحال ولقد اعيتني  
المدخل فيه مع حرصى الذى  
تفردت به فى ايامى وبذل المكن  
غير شحيح عليه فى جمع كتبهم من  
المقان، واستحضار من يهدى لها  
من المكامن وامن غيرى مثل ذلك  
الا ان يرزق من توفيق الله ما حرمته  
فى القدرة على الحركات عجزت فيها  
عن القبض والبسط فى الامر  
والنهي طوى عنى جابها، والشكر  
لله على ما كفى منها۔

ہندوستان میں جو صورت حال مجھے  
پیش آئی وہ یہ تھی کہ باوجود علم کی حرص  
میں متفرد ہوں اور میں نے ہر طرح کی  
کوشش کرنے میں بھی کمی نہیں کی،  
میں نے ہر ایسی جگہ سے جس کا گمان کیا  
جاسکتا تھا کتابیں جمع کرنی چاہیں اور  
ایسے لوگوں سے کام لینا چاہا جو ان کی  
مخفی جگہوں کا سراغ بتا سکتے تھے نیز وہ یہ  
خرچ کرنے سے بھی ہاتھ نہیں روکا  
تاہم مجھے کام کی بے روک راہ نہ ملی  
اور ان راہوں میں قدم بڑھانے کی کوشش  
نے مجھے عاجز کر دیا۔ میں اپنی مرضی سے  
کام نہیں کر سکتا تھا اور امر و نہی کے  
احکام میں بے بس تھا، اب وہی شخص



اس کمی کو پورا کر سکے گا جسے نقل و حرکت  
کی وہ آزادیاں خدا کی توفیق سے میسر آجائیں  
گی جن سے مجھے محروم رہنا پڑا۔

ڈاکٹر اڈورڈ ڈھاؤر سناؤ، نے جنہوں نے کتاب الہند کی تصحیح کی ہے اور پھر اس کا  
انگریزی ترجمہ مرتب کیا، اس تفریح سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ پنجاب میں البیرونی کو نقل و  
حرکت کی پوری آزادی حاصل نہ تھی اور سلطان محمود سے اس کے تعلقات کشیدہ  
تھے چونکہ سناؤ کے پیش نظر البیرونی کی دوسری مصنفات نہ تھیں اس لیے وہ اس  
بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔

لیکن اب تحدید نہایات الاماکن کے بعض مقامات سے مزید اشارے نمایاں  
ہو گئے ہیں اور ایک مقام پر تو بالکل واضح لفظوں میں اُس نے اپنی پُر مصائب زندگی  
کا شکوہ کیا ہے، وہ اس کتاب کی اُس فصل میں جو شہروں کے عرض بلد اور میل کلی  
وجزی کی معرفت کے بارے میں لکھی ہے، لکھتا ہے:

جس دن میں نے یہ فصل لکھی اس روز  
میں کابل کے قریب جنیور نامی ایک قریبے  
میں مقیم تھا اور یہ منگل کا دن اور جمادی الاخر  
کا مہینہ تھا اور چار سو نو برس ہجرت پر  
گزر چکے تھے۔ مجھے یہاں کی اقامت پر  
میرا حرص کی اس شدت نے مجبور کیا جو  
ان مقامات کے عروض کی تحقیق و معرفت  
کے لیے مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔ میں  
آجکل ایسی آزمائشوں میں ڈال دیا گیا  
ہوں کہ شاید حضرت نوح اور حضرت  
لوط علیہم السلام بھی ایسی آزمائشوں میں نہ ڈالے  
گئے ہوں گے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ خدا  
کی رحمت کے حصول اور اس کی طلب و  
فریاد کے لحاظ سے ان دونوں کے ساتھ  
میں تیسرا ہوں گا۔ بہر حال کابل کا عرض نہ  
یہ ثابت ہوا۔

وانی یوم کتبتی هذا الفصل وهو یوم  
الثلاثاء غرة جمادی الاخره سنة  
تسع واربعماية للهجرة كنت بجيخور  
قرية الى جنب كابل وقد حملني شدة  
الحرص على رصد عروض هذه الطواضع  
وانا معتن بما اظن ان نوحا و لوطا  
عليهما السلام لم يمتنا بمثله و راجح  
ان اكون ثالثهما في نيل رحمة الله  
والغياث بمنه... فاجتمع نه يطو ذلك  
تمام عرض كابل... (صفحة المعموره،

یہ تصریح کتاب الہند کی تصریح کی طرح رمزد کنا یہ میں نہیں ہے بلکہ صاف اور واضح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۹ سالہ میں وہ اپنی زندگی کو اسی درجہ مصیبت زدہ محسوس کرتا تھا کہ اسے حضرت نوح اور حضرت لوط کی مصیبتیں یاد آگئی تھیں۔ ان دونوں پیغمبروں کو جو مصیبت پیش آئی تھی اس کی نوعیت کیا تھی؟ وہ ان کی قوم کا انکار اور وجود تھا۔ ایک بڑی مدت تک وہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہے لیکن ان کی کوئی کوشش سود مند نہ ہوئی اور بالآخر انھیں یک قلم مایوس ہو جانا پڑا یہاں قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ کیا اُس عہد میں البیرونی کی مصیبتیں بھی اسی نوعیت کی مصیبتیں تھیں؟ کیا وہ ایسے لوگوں میں گھرا ہوا تھا جنہیں وہ اپنے اخلاص عمل اور صداقت مقصد کا یقین نہیں دلا سکتا تھا؟ اور وہ اُسے برابر شک و شبہ اور انکار و عناد کی نظروں سے دیکھتے تھے یہاں تک کہ اُسے اصلاح حال کی طرف سے بالکل مایوس ہو جانا پڑا تھا؟ اگر اس تصریح کے پیچھے یہ تمام تفصیلیں چھپی ہوئی ہیں تو ہمیں چاہیے کہ زیادہ گہرائی میں اُتریں اور دیکھیں کہ صورت حال کی یہ نوعیت البیرونی کے غزنوی گرد و پیش سے کیوں کر مطابق کی جا سکتی ہے؟

خوارزم کی تاریخ سے ہمیں یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ سلطان محمود غزنوی کا وہاں تسلط ۹۸۵ء میں ہوا تھا اور اسی سال کے بعد سے البیرونی کی دربار غزنی سے وابستگی شروع ہوئی۔ پس ۹۸۵ء کا زمانہ یقیناً وہی زمانہ تھا جب البیرونی نیا نیا سلطان محمود کے دربار میں پہنچا تھا اور ابھی اس صورت حال پر زیادہ سے زیادہ ایک برس کی مدت گزری تھی۔ اس ایک برس کے اندر حالات کی جو رفتار رہی اُس کے اثرات ہم البیرونی کی مندرجہ صدر تصریح میں دیکھ رہے ہیں وہ اپنے آپ کو ایک سخت مصیبت زدہ انسان تصور کرتا ہے اور ایسے پیغمبروں کے حالات زندگی میں اپنی حالت کی مشابہت ڈھونڈتا ہے جن کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کی اصلاح سے یک قلم مایوس ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال کی کوئی معقول توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ ہم البیرونی اور سلطان محمود کے باہمی علاقہ کو ان کی انتہائی کشیدگیوں اور ناخوش گواریوں کے ساتھ اپنے سامنے نمایاں ہونے دیں۔ جو نہی صورت حال کی یہ تصویر نمایاں ہوتی ہے معاملہ اپنی پوری تفصیلی شکل میں ابھر آتا ہے اور البیرونی کے مندرجہ صدر لفظوں کے اندر واقعات و حوادث کی ایک طویل طویل داستان بولنے لگتی ہے۔

دربارِ غزنی سے البیرونی کی وابستگی ناخوشگوار حالات میں ہونی تھی۔ تاہم اسے امید تھی کہ اس کے علم و فضل سے تغافل نہیں کیا جائے گا اور وہ اپنی حسن نیت اور اخلاصِ عمل کی طرف سے سلطان کو مطمئن کر سکے گا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی اور اس کی کوئی کوشش بھی سلطان کو مطمئن اور خوش گمان نہ بنا سکی۔ اب وہ ایک عجیب لا علاج حالت میں اپنے آپ کو مبتلا پاتا ہے نہ تو اس پر قادر ہے کہ سلطان کے دائرہ اقتدار سے باہر چلا جائے نہ اس کی توقع رکھ سکتا ہے کہ غزنی ہی میں رہے اور مطمئن اور خوش حال رہے۔ گویا زندگی کی دونوں ممکن راہوں کا دروازہ اس پر بند ہو چکا تھا۔ صورت حال کی یہی منزل ہے جہاں پہنچ کر اسے مایوسی کا آخری تلخ گھونٹ پینا پڑا اور بے اختیار اس کے قلم سے نکل گیا کہ نوح اور لوط علیہما السلام کو یاس و قنوط کے جس امتحان کے مرحلے سے گزرنا پڑا تھا وہی مرحلہ مجھے بھی پیش آ گیا ہے۔ اس صورت حال کی وضاحت کے لیے ہمیں حسب ذیل امور پر غور کرنا چاہیے۔

(۱) البیرونی کی نشوونما خوارزم میں ہوئی۔ ملوک خوارزم اس کے سرپرست تھے اور ابو العباس مامون کا تو وہ معتمد خاص تھا جس سے سلطان محمود نے تہمت چھڑا کر شروع کی تھی۔ بالآخر محمود نے حملہ کیا اور خوارزم پر قبضہ ہو گیا۔ محمود کی نسبت تمام مورخوں کا بالاتفاق بیان ہے کہ وہ سخت سلی طبیعت کا آدمی تھا اور ہر ایسے شخص کو جو وقت کے کسی دوسرے دربار سے وابستگی رکھ چکا ہو معاندانہ نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں البیرونی کی شخصیت اس کی نظروں میں ضرور ایک مشتبہ شخصیت بن گئی ہوگی۔ وہ اسے ملوک خوارزم کا نمک پروردہ اور معتمد علیہ سمجھ کر شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہوگا اس کی نگرانی کی جاتی ہوگی اور اسے نقل و حرکت کی آزادی حاصل نہ ہوگی۔

(۲) البیرونی سلطان کے دربار میں پہنچا کیونکر؟ اس بارے میں متضاد نوعیت کی روایتیں ہم تک پہنچی ہیں، تاہم ایک بات ان سب میں قدر مشترک ہے یعنی وہ کوئی خوشگوار صورت حال نہ تھی۔ یاقوت الحموی نے معجم الادبار میں بعض افانٹل قبت کی طرف منسوب کر کے ایک روایت نقل کی ہے کہ فتح خوارزم کے بعد سلطان محمود نے البیرونی اور اس کے استاد عبدالصمد اول بن عبدالصمد الحکیم کو گرفتار کرایا تھا۔ عبدالصمد کو تو قمر مطلی قرار دے کر قتل کر دیا گیا مگر البیرونی بچ گیا کیونکہ سلطان سے کہا گیا یہ بہت بڑا نجومی ہے اور اس کی مہارت فن سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ نظامی عروضی نے چہار مقالہ میں اور صاحب نگارستان نے نگارستان میں ایک دوسری روایت بھی لکھی

ہے اس کا ما حاصل یہ ہے کہ سلطان نے فتح خوارزم سے پہلے ایک ایچی خوارزم بھیجا تھا اور دربار خوارزم کے پانچ حکیموں کو جن میں ایک ابو علی سینا تھا اپنے یہاں طلب کیا تھا وہ سب سے زیادہ خواہش مند ابن سینا کا تھا لیکن ان پانچ میں سے دو یعنی ابو علی سینا اور ابو سہل غزنی جانے پر راضی نہ ہوئے اور خوارزم سے نکل گئے مگر البیرونی، ابوالخیر اور ابوالنصر نے دربار غزنی کی وابستگی منظور کر لی، چونکہ اس کارروائی سے اصل مقصود ابو علی سینا کی طلبی تھی اور وہ ہاتھ سے نکل گیا تھا اس لیے سلطان کی طبیعت سخت رنجیدہ ہوئی اور ان تین حکیموں کی نجوم دانی کا امتحان لیا گیا۔ نظامی اور نگارستان کی یہ روایت رطب و ایا بس کا مجموعہ ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ واقعے کے چند تاریخی اجزاء، افسانہ گوئی کے اجزاء سے مخلوط ہو گئے ہیں، تاہم اس سے بھی صورت حال کی جو نوعیت سامنے آتی ہے اس سے یہی نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ البیرونی کا دربار غزنی میں داخلہ خوشگوار حالات میں نہیں ہوا تھا۔ اس لیے افسانہ پردازوں نے طرح طرح کی کہانیاں مشہور کر دی تھیں۔

(۳) ایک بات صاف اور قطعی ہے۔ سلطان محمود نے البیرونی کے ساتھ جو سلوک بھی کیا ہو اس کی تہہ میں اس کے علم و حکمت کی صحیح معرفت اور قدر شناسی نہ ہوگی، یہ غلط فہمی ہوگی کہ وہ فن نجوم (اسٹرا لوجی) میں ماہر تھا۔ علوم فلکیہ کی تاریخ کا یہ ایک مسلمہ واقعہ ہے کہ علم ہیئت اور فن نجوم یعنی سعادت و نحوست کو اکب کے فن کا باہمی فرق مدتوں تک غیر واضح رہا۔ جو امتیازی نقطہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے، وہ قدیم زمانے میں اتنا باریک تھا کہ عام نگاہیں بہت کم اسے محسوس کر سکتی تھیں اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہیئت کے ماہر کو فن نجوم کا ماہر سمجھ لیا جاتا تھا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابو محمود الجندی، ابن جابر البتانی، ابو معشر الفلکی، عمر البیہام، نصیر الدین الطوسی وغیر ہم جنہیں فن نجوم کے ادہام و خرافات سے کوئی دور کا بھی تعلق نہ تھا محض اس لیے نجومی مشہور ہو گئے کہ لوگوں نے ان کی نگاہیں ستاروں کی طرف اٹھی ہوئی دیکھی تھیں اور وہ خیال کرتے تھے کہ ستاروں کی حرکات کا مطالعہ صرف اس لیے کیا جا سکتا ہے کہ فن نجوم کا اعتقاد اسی رخ پر لے جاتا ہے۔ نظامی، الجندی اور صاحب نگارستان نے البیرونی کی نسبت جو حکایتیں لکھی ہیں ان کے اندر بھی یہی غلط فہمی کام کر رہی ہے۔ البیرونی کے بے لاگ علمی دماغ کا تو یہ حال تھا کہ جس شخص کو ریاضی و ہیئت کے ساتھ فن نجوم کے اعمال و احکام سے بھی دلچسپی ہوتی وہ اس کے بیانات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگتا کیونکہ وہ خیال کرتا کہ بہت ممکن ہے فن نجوم کے عقیدہ سے اس کا رصدی عمل غیر محسوس طریقے پر متاثر ہو گیا ہو۔

خیاںچہ اس نے نیشاپور کے طول بلد کی بحث میں منصور بن طلحہ کی تشریح کو صرف اس لیے مشکوک ٹھہرایا کہ "کان مولعاً بعلم النجوم" وہ علم نجوم سے دلچسپی رکھتا تھا لیکن زمانے کی غلط اندیشیوں کا یہ تصرف دیدنی ہے کہ ایسا محتاط شخص بھی نجومی ہونے کے اتہام سے محفوظ نہ رہ سکا، واللہ درما قال:

مریم این راستمحل شد و عیسیٰ برداشت

البیرونی کے عہد سے تقریباً پچاس ساٹھ سال بعد امام مخرالدین الرازی نے اپنی مشہور تفسیر لکھی ہے۔ وہ سورہ کہف کی تفسیر میں ایک جگہ البیرونی کا قول ذوالقرنین کی شخصیت کی نسبت نقل کرتے ہیں اور اس کا نام اس طرح لکھتے ہیں کہ "ابوالریحان البیرونی المنجم"۔

یہ روایت کہ سلطان محمود نے البیرونی کی جان بخشی اس کے نجومی ہونے کے خیال سے کی صحیح ہو یا نہ ہو لیکن سلطان کی دماغی استعداد پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ البیرونی کے علمی مقام کی اندازہ شناسی کے لیے وہ قطعاً غیر مستعد تھا اور اس کے فنگلی اعمال کے ذوق و انہماک کو صرف اسی صورت میں دیکھ سکتا تھا کہ اُسے نجومی تصور کر لے۔ اس سے زیادہ کے لیے اس کے پاس کوئی دماغی استعداد نہ تھی۔ اس صورت حال میں بھی ہمیں البیرونی کے احساسات کی تلخی اور مایوسی صاف صاف نظر آ جاتی ہے۔ ایک ایسے بادشاہ کی سرپرستی اسے کیوں کر مصلحت اور خوشحال کر سکتی تھی جو زیانفیات اور ہیبت کے ایک بالکمال شخص کی قدر شناسی کے لیے کوئی ذہنی استعداد نہیں رکھتا تھا اور اگر قدر شناسی کے لیے آمادہ بھی ہوتا تھا تو صرف اس لیے کہ اسے فن نجوم کے اوبام و خرافات کے اعتقاد سے سہم تصور کر لے۔

(۴) سلطان محمود کی دماغی اور اخلاقی سیرت کے جس قدر حالات تاریخ کے براق نے محفوظ کر لیے ہیں، ان سے ہم اس غیر معمولی شخص کے انداز طبیعت کی ایک تصویر کھینچ لے سکتے ہیں۔ اس میں عزم و عمل اور ہمت و شجاعت کے بے نظیر اوصاف تھے وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا فوجی سپہ سالار تھا۔ اس کی حکمرانی کا دامن شخصی ظلموں کے ظلم و ستم کے عام دہسوں سے کم داغ دار ہوا۔ وہ بقول انگریز مورخ ٹین کے میدان جنگ میں کٹنا ہی خود بخود نظر آتا ہو مگر تخت حکومت پر عدل و مساوات کا خواستہ کار تھا لیکن ان تمام اوصاف کے ساتھ اس کی دماغی شخصیت کا دوسرا رخ بھی ہمیں نمایاں کرنا پڑتا ہے۔ وہ کامل معنوں میں اپنے عہد کا ایک نرس سپاہی تھا اور علوم و معارف کے میدانوں میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اُس کے ذہنی عقاید

کا تصور نہایت پست اور محدود درجہ کا تھا۔ وسعتِ نظر کی کوئی پرچھائیں بھی اس پر نہیں بڑی تھی۔ اس زمانہ میں اسماعیلی فرقہ کے مبلغ عالمِ اسلامی میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور ان کی ایک شاخ نے جو قرآنِ مطہر کے نام سے مشہور ہوئی، عراق اور حجاز میں سخت پھیل چکا ہی تھی۔ سنہ میں فاطمی خلافت قائم ہو چکی تھی اور اس کے داعی تمام عالمِ اسلامی میں ظاہر و مخفی اپنی دعوت پھیلا رہے تھے۔ چونکہ یہ لوگ اپنے مذہبی عقاید کو عقلی توجیہات کی آمیزش کے ساتھ پیش کیا کرتے تھے اور فلسفہ و عقلیات کے حامی تھے اس لیے سلطان کے خیال میں ہر شخص جو حکیمانہ فہم و ذوق رکھتا ہو قرمطی تھا اور اس لیے واجبِ القتل تھا۔ اس نے اپنے دورانِ حکومت میں بے شمار آدمیوں کو محض اس لیے قتل کرایا کہ وہ اسماعیلیت اور قرمطیت سے متہم ہو گئے تھے اگرچہ فی الحقیقت اسماعیلی نہ تھے۔ ریاضت الحموی نے معجم میں اور ظہیر الدین البیہقی نے تہذیب صوان الحکمتہ میں ایک روایت نقل کی ہے۔ جس سے سلطان کی اس ذہنیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ سلطان کے دربار میں شمالی چین یعنی ختا کا ایک ایچی آیا تھا جو تعلیم یافتہ آدمی تھا اور قطب شمالی کے قرب و جوار کی بعض خصوصیات سے واقف تھا۔ اس نے سلطان سے کہا کہ قطب کے قرب و جوار میں ہمیشہ سورج کی روشنی نمایاں رہتی ہے اور رات کی تاریکی کا وقت ظہور میں نہیں آتا۔ سلطان نے اپنی عادت کے مطابق اس بیان کو الحاد اور قرمطیت پر محمول کیا حالانکہ اس شخص کو اس طرح کے عقاید سے کوئی واسطہ نہ تھا، وہ سیاحوں کا مشاہدہ بیان کر رہا تھا نہ کہ اپنا ذاتی عقیدہ۔ بہر حال اس موقع پر البیرونی کی دانش و حکمت ناکام نہیں رہی۔ وہ سورج اور زمین کا باہمی تعلق واضح کرتا ہے اور سلطان کو یقین دلاتا ہے کہ دونوں قطبوں کے پاس اس طرح کی صورت حال کا ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ اس سے انکار کرنا ایک علمی حقیقت سے انکار کرنا ہوگا۔ (المعجم، جلد ۶، صفحہ ۱۰۱ و تہذیب صوان الحکمتہ، نسخہ کتب خانہ ملامراد، استنبول)۔

فقال مروزی نے سلطان کے شافعی مذہب اختیار کرنے کی جو حکایت نقل

۱۔ معجم اور تہذیب صوان الحکمتہ دونوں میں قطب جنوبی کا لفظ ہے لیکن ای۔ ڈائوہ میں (E. Wiedemann) نے معجم کی روایت پر بحث کرتے ہوئے اسے راوی یا کاتب کی غلطی سے تعبیر کیا ہے اور خیال کیا ہے کہ اصل میں قطب شمالی ہوگا کیونکہ قطب جنوبی کی نسبت ایک چین کے سے کو کیا واقفیت ہو سکتی ہے میں بھی خیال کرتا ہوں کہ قطب شمالی ہی ہونا چاہیے۔ (آزاد)

کی ہے اس سے بھی ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کی مذہبی معلومات کا کیا حال تھا، سلطان کا خاندان، تمام ترکوں کی طرح حنفی تھا لیکن علماء دور بار میں بعض شوافع موجود تھے اور وہ شافعی مذہب کی فضیلت پر زور دیتے تھے۔ خود سلطان اس کو بچے سے اس درجہ نابلد تھا کہ ان کی باتیں سنتا اور کوئی رائے قائم نہ کر سکتا۔ بالآخر یہ سٹے پایا کہ ایک مجلس مناظرہ ترتیب دی جائے اور مسیحی عالم کو حکم بنا یا جائے۔ یہ مسیحی عالم غالباً ابو الخیر الحسن بن سوار معروف بابن الخمار تھا۔ اس علمی مناظرہ میں علمی حیثیت کوئی بحث نہیں ہوئی بلکہ یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ سلطان کے سامنے حنفی اور شافعی دونوں طریقوں کی نمازیں پڑھ کر دکھادی جائیں جس طریقہ کی نماز سلطان کو پسند آئے اسے اختیار کر لے۔ چنانچہ شافعی طریق نماز بازی لے گیا اور سلطان شافعی ہو گیا۔

اسی طرح ابو بکر ابن فورک الاصفہانی کے ساتھ جو معاملہ مسایل رویت و حجت کے بارے میں پیش آیا تھا اور جس کی تفصیلات خود ابن فورک نے اپنے مکتوب بنام ابواسحاق الاسفرائینی میں لکھی ہیں، اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ سلطان کا سیدھا سا دھاسپا ہیانہ دماغ کسی علمی اور دقیق بات کے سمجھنے کی بالکل صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ ابن فورک نے بہت کوشش کی کہ رویت باری بلا حجت و محل کا عقیدہ اس کے ذہن نشین ہو سکے لیکن کسی طرح بھی نہ ہو سکا اور وہ بار بار فارسی میں یہ کہتا رہا کہ کیف یعقل شیء لانی جہتہ؟

(۵) سلطان کی طبیعت کا سخت شکی اور بہت دھم دھماکا ہونا بھی ہمیں تاریخی تصریحات سے معلوم ہو چکا ہے۔ وہ استقامت طبع اور بہت دھرمی ہیں۔ فرق نہیں کر سکتا تھا اس نے بہت دینی کو استقامت رائے سمجھ لیا تھا۔ اسی طبیعت کا بادشاہ یقیناً اسیرونی جیسے حکیمانہ مزاج کے آدمی کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہوگا اور ہمیں معلوم اسے شب و روز کس طرح کی مصیبت انگیز زندگی بسر کرنی پڑی ہوگی۔

خود اسیرونی کی بعض تصریحات سے بھی اس صورت حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب الجہا ہر میں ایک جگہ موتوں کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

وقد شوہد من فعلہا ای النار  
باللآلی فی بیوت الاصنام الہنی  
احرقہ الغزاة بعد ودرانہ (ای  
بلند شہر اچالی) ... فکان لوہا  
اور موتیوں پر آگ بولہاں جہا شریک الداب  
وہ اس موقع پر دیکھتے ہیں آیا شہر جب  
براز (یعنی بلند شہر اچالی) کے بت خانوں  
کو نمازیوں نے آگ لگا کر جلا دیا تھا۔

ساحبھا انا سورنی یدا الامیر میدن  
الدولة راسله بان هولاء العجائین  
یخسر ونک فی الجواهر بما یعظم  
مقداره فارفعها ثم خلجم والاحراق  
فلم یلتفت الی قوله اصداً کعارته  
کانت فی المخالفة وکان بعد همد النیر  
یفتش رادها فیوجد فیها الحبات الکبار  
النفیسة کا نماخر طت من طباشیر و  
یوجد ما ینتفع به  
(صفة المعمورة صفحہ ۷۶)

برائے کے راجہ جوہر نے جو امیرزمین الدولہ  
کے ہاتھ قید ہو چکا تھا اسے اس مضمون  
کا پیغام بھیجا کہ یہ دیوانے غازی چاہتے  
ہیں کہ بت خانوں کو جلا کر تجھے ان نہایت  
قیمتی جواہر سے محروم کر دیں جو ان کے  
اندروں میں تھے چاہیے کہ پہلے  
ان جواہر کو وہاں سے نکال لے ورنہ وہ  
بھی جل کر راکھ ہو جائیں گے مگر امیر نے  
راجہ کی بات پر کوئی توجہ نہیں کی کیونکہ  
اسکی عادت تھی کہ ہر بات جو کہی جاتی تھی  
اسکی مخالفت کرتا تھا اور اپنی بات سے  
نہیں ہٹتا تھا لیکن جب آتش زدگی کے  
بعد جلے ہوئے بت خانوں کی تفتیش کی گئی  
تو اس میں جلے ہوئے موتیوں کے دانے  
اس طرح ملے جیسے طباشیر کے ٹکڑے  
ہوں کیونکہ وہ جل کر خاکستر ہو گئے تھے۔

بہر حال البیرونی نے تحدید نہایات الاماکن میں اپنے حالات کی طرف جو اشارہ  
کیا ہے وہ ہمیں بہت دور تک لے جاتا ہے اور ہم اس کے اور سلطان محمود کے رشتہ  
علاقہ کی نوعیت کی ایک تفصیلی تصویر کھینچ لے سکتے ہیں۔ اس نے کتاب البند میں جو  
جمل اشارہ کیا ہے اس کا مطلب بھی اب اچھی طرح واضح ہو گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسے پنجاب آنے کا موقع تو مل گیا تھا لیکن نقل و حرکت کی  
پوری آزادی نہیں ملی تھی اور اس کی علمی تحقیقات کی سرگرمیوں میں طرح طرح کی  
رکاوٹیں ڈال دی گئی تھیں۔ ان ہی رکاوٹوں کی طرف اس نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے  
کہ "اپنے حالات کے امر و نہی کا رشتہ میرے قبضے میں نہیں ہے"

لیکن اگر محمود کی طرف سے البیرونی کے تاثرات کا یہ حال تھا تو پھر البیرونی نے  
اپنے اس قصیدہ میں جسے الحموی نے معجم میں نقل کیا ہے محمود کا ذکر ان لفظوں میں کیوں  
کیا تھا؟



وَلَمْ يَنْقَبِضْ مُحَمَّدٌ عَنِّي بِنِعْمَةٍ  
 ذَا غِنًى رَاقِبًى مَغْنِيًا عَن مَكَاسِيَا  
 عَفَا عَن جِهَالَاتِي وَابْدَى تَكْرَمًا  
 رَطْرَبًى بَجَاهٍ رَوْنَقِي وَبِلَبَاسِيَا  
 یعنی محمود نے کوئی نعمت مجھے عطا کرنے میں کمی نہیں کی، اُس نے مجھے غنی کر دیا  
 اور میری زیادہ طلبی سے چشم پوشی کی۔ اس نے میری نادانیوں سے درگزر کی اور میری  
 عزت کرنے لگا۔ اس کے جاہ و جلال سے میری رونق تازہ ہو گئی۔ یہ قصیدہ اس نے  
 ابو الفتح بستی کی مدح میں لکھا تھا۔ اس میں اپنی زندگی کے مختلف دوروں کی طرف  
 اشارات کئے ہیں۔

البیرونی کی ان دونوں مختلف تصریحات کو یوں جمع کیا جاسکتا ہے کہ اس کے  
 اور سلطان محمود کے باہمی علاقہ کے مختلف دور سے ہوں گے۔ ابتدائی دوز کشیدگی  
 شک و اشتباہ اور ناقدر شناسی کا تھا پھر حالات کی رفتار بتدریج بدلنے لگی اور  
 بالآخر ایک ایسا دور رونما ہو گیا جب سلطان کی فیاضانہ سرپرستی اُسے حاصل ہو گئی تھی۔  
 البیرونی نے یہ قصیدہ سلطان کے انتقال کے بعد لکھا ہے۔ اب سلطان دنیا میں نہ تھا  
 اور مناسب بھی تھا کہ جگہ انوکھا موتا کہ باخجی اس کی کوتاہیاں بھلا کر اس کی آخری عہد  
 کی فیاضیوں کو سراہا جائے، چنانچہ اب البیرونی اس کی سرپرستیوں کا اعتراف کرتا ہے  
 اور اس کی ابتدائی مخالفتانہ روش کو یاد رکھنا نہیں چاہتا۔

علاوہ بریں معاملہ کا یہ پہلو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جس زمانے میں البیرونی  
 نے یہ قصیدہ لکھا ہے اُس وقت سلطان محمود کا لڑکا سلطان محمود حکم ان تھا اور اس کی  
 فیاضانہ سرپرستیاں البیرونی کو حاصل ہو گئی تھیں۔ البیرونی اس کی فیاضیوں سے  
 اس درجہ متاثر ہوا تھا کہ اس نے اپنی سب سے زیادہ اہم تصنیف اسی کے نام سے لکھی تھی یعنی  
 الفانوان المبعودی۔ ایسی حالت میں یقیناً وقت کا مقتضی بھی تھا کہ اپنے فیاض سرپرست  
 اور قدر شناس بادشاہ کے باپ کا ذکر حتی الامکان اچھے لفظوں میں کرے اور اس  
 عہد کی ناگوار باتوں کی تلخیاں بھلا دے۔

## ہندستان میں البیرونی کی حدود سیاحت

ڈاکٹر اڈورڈ زخاؤر (سحاؤ) نے کتاب البند کی ایک تصریح سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ البیرونی کی حدود سیاحت ہندوستان میں ملتان اور لاہور سے آگے نہیں بڑھی تھی، چنانچہ اس وقت سے یہ بات بطور ایک مسلمہ واقعہ کے تسلیم کر لی گئی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ البیرونی نے ہندوستان میں سے صرف ملتان اور لاہور کو دیکھا تھا۔

لیکن ۱۹۰۶ء میں جب مجھے القانون المسعودی کے نسخہ امیر علی لاہوری کلکتہ کے مطالعہ کا موقع ملا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ رائے نظر ثانی کی محتاج ہے۔ اب تو گان آفندی کے اس مجموعہ کے مطالعہ کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ البیرونی کی سیاحت ہند کا دائرہ صرف پنجاب ہی میں محدود نہ تھا۔

البیرونی ایک خاص رصدی عمل کا ذکر کرتے ہوئے القانون میں لکھتا ہے کہ جب میں ہندوستان میں تھا تو ایک ایسے مقام پر جو سمندر کے کنارے ہے مجھے اس عمل کے انجام دینے کا موقع ملا۔ سوال یہ ہے کہ اگر البیرونی کی سیاحت ہند صرف پنجاب کے ایک حصہ ہی تک محدود رہی تھی تو یہ ساحلی مقام کونسا تھا؟ ظاہر ہے کہ پنجاب میں نہیں ہو سکتا۔ سمندر ہندوستان میں یا تو جنوب کی طرف مل سکتا ہے یا پچھم کی طرف۔ البیرونی کا ہندوستان کا جنوبی حصہ تک پہنچنا بہت دشوار تھا اور اس کی تمام تصدیقات اتنے وسیع اور طولانی دائرہ سیاحت کے قطعاً خلاف ہیں، پس صرف پچھم کا ساحلی حصہ رہ جاتا ہے جہاں وہ پہنچ سکتا تھا اور قیاس چاہتا ہے کہ یہ سندھ کا علاقہ ہوگا۔

ویسے بھی یہ بات بہت مستبعد معلوم ہوتی تھی کہ البیرونی پنجاب آیا ہو اور اس نے سندھ کی سیاحت کا قصد نہ کیا ہو۔ محمد بن قاسم کے عہد سے اسلامی حکومت بلا انقطاع سندھ میں قائم رہی اور اس زمانہ میں وہ بھی پنجاب کی طرح سلطان محمود کے زیر حکومت آچکا تھا۔ پس کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ البیرونی نے سندھ کی سیاحت نہ کی ہو۔ القانون کی مندرجہ صدر تصریح نے اس قیاس کی پوری طرح تصدیق کر دی، کیونکہ ایسی جگہ جو سمندر کے ساحل پر ہوائے سندھ ہی میں مل سکتی تھی۔ اب البیرونی کی کتاب البند کے اقتباسات سے جو اس مجموعہ میں شامل کیے گئے ہیں اس خیال کی مزید تصدیق ہو گئی وہ

”جرجیز“ کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔  
 ”ملتان اور سندھ کے درمیان جو جنگل واقع ہیں، ان میں میں نے دیکھا کہ دو طرح کی بوٹیاں اس چیز کی پیدا ہوتی ہیں۔ پھر ان دونوں قسموں کی پیدائش کی خصوصیات بیان کی ہے۔ (صفحة المغمورہ، ۱۱۴)

پھر اسی کتاب میں سیب کے اقسام پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔  
 ”میں نے کشمیر کے پہاڑوں میں ایک قسم کا سیب دیکھا جو قسم اہلی سے مختلف نہیں ہے، البتہ اس کے درخت میں کانٹے بہت زیادہ ہوتے ہیں“ (ایضاً۔ صفحہ ۱۱۴)  
 کتاب الصيدنہ کی ان دونوں تصریحوں کو جب ہم القانون کی تصریح کے ساتھ جمع کرتے ہیں تو البیرونی کی حدود سیاحت کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ سندھ، پنجاب اور کشمیر، ان تینوں علاقوں میں اُسے سیاحت کا موقع ملا تھا، غالباً وہ غزنی سے کابل گیا، کابل سے پرمشاورد پشاورد حالی، نیں آیا اور لاہور اور کوہستان کشمیر کی سیاحت کی، پھر ملتان گیا اور غالباً اس کی تحصیل سنسکرت و تحقیقات جہد کا بڑا زمانہ وہیں بسر ہوا۔ پھر ملتان سے سندھ گیا اور سندھ سے غزنی۔

سلطان محمود کا قبضہ خوارزم پر سنہ ۱۰۱۷ء میں ہوا اور اسی سنہ میں البیرونی غزنی پہنچا۔ تحدید نہایات الاماکن کی جو عبارت نقل کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سنہ کے ایک برس بعد یعنی سنہ ۱۰۱۸ء میں وہ کابل کے قریب ایک گاؤں میں مقیم تھا۔ اسی طرح القانون کے ایک مقام سے جہاں اس نے غزنی کے طول بلد کی تصریح کی ہے، سنہ ۱۰۱۸ء میں اس کا غزنی میں ہونا ہمیں معلوم ہو چکا ہے۔ پس ڈاکٹر زفاور سخاؤ کے اس قیاس کی اب مزید تصدیق ہو گئی کہ اس کی سیاحت ہند کا زمانہ سنہ ۱۰۱۸ء کے بعد شروع ہوا اور غالباً نو دس برس تک جاری رہا۔

# البیرونی کی دماغی سیرت

البیرونی کی زندگی کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کا بے لاگ علمی یعنی سائنٹیفک دماغ ہے۔ اس کی یہ خصوصیت ہر جگہ اس کے ساتھ آتی ہے۔ کوئی دینی عقیدہ، کوئی قومی روایت، کوئی ساریجی مسئلہ اس کی اس خصوصیت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اس کی عقلیت بے لچک، بے داغ اور ناممکن التخیر ہے۔

الآثار الباقیہ اور کتاب الہند میں اسکی یہ خصوصیت جا بجا نمایاں ہوئی ہے اور اہل علم کی بحث و نظر میں آچکی ہے۔ ہم یہاں ان مباحث کو ذکر نہیں جاتے۔ البتہ کتاب البصیرۃ اور الجماہیر کے مطالعہ سے جو بعض نئے شواہد روشنی میں آئے ہیں ضروری ہے کہ ان پر نظر ڈال جائے۔

تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے تلامذہ عرب مورخوں اور ستیا حوں نے سنگل دیپ یعنی سیلون (سیلان) کی معدن یا قوت کا ذکر کیا ہے نیز ایک پہاڑ کا جسے وہ "جبل البرق" کے نام سے موسوم کرتے تھے یعنی بجلیاں چمکانے والا پہاڑ۔ ان دو باتوں نے جمع ہو کر طرح طرح کے وہی قصے مشہور کر دیے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان قصوں کا سرچشمہ مغربی ہندوستان کے ساحلی مقامات تھے جہاں عراق اور مصر کے عرب جہاز راں آتے رہتے تھے۔ از انجملہ ایک روایت یہ تھی کہ وہاں راون کا پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر ہمیشہ بجلی چمکتی رہتی ہے اور یہی بجلی ہے جس کے اثر سے یا قوت بنتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ "راون" سے مقصود ہندوستان کے مشہور اسطورہ رامائن کا وہ غفریت ہے جسکی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ سیلان کا پادشاہ تھا۔ عربوں نے "راون" کو راہون بنا دیا اور جبل الراءون کے افسانے عربی تاریخوں میں سرایت کر گئے۔ چنانچہ المسعودی، ابن حوقل، المقدسی اور نصر بن احمد الخلیسی وغیرہم سب نے "جبل الراءون" کا ذکر کیا ہے اور طرح طرح کے عجائب و خوارق اس کی طرف منسوب کر دیئے ہیں۔ الجماہیر میں البیرونی ان افسانوں کو نقل کر کے پہلے "جبل البرق" کی یہ توجیہ کرتا ہے کہ وہ غالباً آتش فشاں پہاڑ ہو گا جس کی چوٹی پر آگ کے شعلوں سے بجلی کی سی جھپک درختاں ہوتی رہتی ہے پھر لکھتا ہے کہ "ہذا من اشباہ الخرافات التي ساهکت بعضها عن الفرس" (صنفہ المعمورہ سفر ۷۰) یعنی یہ قصے خرافات کی طرح ہیں، جیسے کہ ایرانیوں میں بھی مشہور ہو گئے تھے اور جن میں سے بعض قصے میں آئندہ جان کروں گا۔

اس طرح ہریت الاحمر یعنی سرخ گندک کے عجیب و غریب خواص لوگوں میں مشہور ہو گئے تھے اور خواص ان اشیاء کی طبی کتابوں میں بھی انھوں نے جگہ پائی تھی۔ ایرانیوں میں مشہور تھا کہ کوہ دہاوند میں اس کی کان ہے۔ البیرونی ان تمام قصوں کی ہنسی اڑاتا ہے اور انھیں یک قلم بے اصل قرار دیتا ہے۔ (انسان، صفحہ ۷۶) لہذا الجیہانی کی کتاب المسالك والبلدان چوتھی صدی ہجری کے بعد کے مسلمانوں کا کا ایک بڑا مانند ہے۔ خود البیرونی نے جا بجا اس کے حوالے دیے ہیں۔ اس نے روم کے کینہہ اصطفانوس (Santo Stefano) کا حال لکھتے ہوئے طرح طرح کی دوراز عقل روایتیں درج کر دی تھیں جو بعد کی کتابوں میں بھی برابر نقل ہوتی رہیں۔ مثلاً کینہہ کے ایک ہزار دروازے ہیں اور میں ہاتھ لمبی زمرہ کی قربان گاہ ہے، البیرونی ان روایتوں کو نقل کر کے ان کی سفاقت پر ہنستا ہے اور لکھتا ہے: "لوضدرت هذه الحکایة عن ارض فارس، نقلت ان ما کان فی الکندر المحترق من الزمرہ وقد السبب فکان منہ ذلک المذبح؛ یعنی اگر اس طرح کا قصہ سرزمین فارس سے تعلق رکھتا تو میں یہ کہہ کر اس کی توجیہ کر لیتا کہ کندر کے قبضہ فارس کے وقت جو آگ لگی تھی اس کی وجہ سے خزانہ کے تمام زمرہ گھل گئے اور ان سے یہ قربان گاہ وصال لی گئی اگرچہ پھر بھی اس مشکل کا حل نکالنا دشوار ہوتا کہ آگ اور زمرہ میں باہم دوستی نہیں، الجیہانی نے کینہہ کے جو ایک ہزار دروازے گنوائے ہیں اس کی نسبت کہنا ہے: "فانذ یقتضی عدم حارط لہا وانما یحیط لہا ابواب متلاصقة"۔ (انسان، صفحہ ۸۰) یعنی اگر یہ کہانی صحیح ہے تو مان لینا پڑے گا کہ کینہہ کا حصار دیوار کی جگہ صرف دروازوں سے جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے بنتے چلے گئے ہیں اور دروازہ کوئی نہیں ہے۔

وسط ایشیا اور ایران کی قدیم وہم پرستیوں میں سے ایک وہم پرستی "سنگ یدہ" کے بارے میں تھی "سنگ یدہ" سے مقصود ایک خاص طرح کا پتھر تھا جس کی نسبت یقین کیا جاتا تھا کہ اس میں برسات برسا دینے کا معجزانہ خاصیت ہے۔ چنانچہ یہ خیال فارسی شاعری میں بھی سرایت کر گیا۔ زینب دانش کہتا ہے:

باعث ریش باران ہر شکم شدہ است  
دل سنگین تو سنگ یدہ را می ماند

یعنی معشوق کا دل پتھر ہے لیکن دو پتھر سنگ یدہ کا پتھر ہے کیونکہ اس کی تاثیر

سے میری آنکھوں سے برسات کی طرح آنسوؤں کی جھڑی برستی رہتی ہے۔ اور میرا  
 محن تاثیر نے کہا ہے: "سنگ دل خوباں بد سنگ یدہ ہاں" اور شاعر ہند شیخ  
 ابراہیم ذوق نے کہا ہے: یہ آیا جوش میں باران رحمت باری

کہ سنگ سنگ میں سنگ یدہ کی ہے تاثیر

تاریخ ہند کے بعض واقعات سے بھی اس وہم پرستی کا ثبوت ملتا ہے۔ اسے  
 آندرام مخلص نے اپنی کتاب "مراۃ المصطلحات" میں لکھا ہے کہ سیف الدولہ ولید جنگ  
 ناظم ملتان کے عہد میں ایک ترک آیا تھا جسکے پاس یہ پتھر تھا۔ وہ یہ پتھر منہ میں رکھ کر  
 آسمان کے نیچے کھڑا ہو جاتا تو بارش ہونے لگتی۔ محمد شاہ شہنشاہ ہند کو یہ حال معلوم  
 ہوا تو اس نے اس ترک کو دارالحکومت دہلی میں طلب کیا لیکن قبل اس کے کہ شاہی حکم  
 ملتان پہنچے وہ وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔

البیرونی الجاہلیہ میں "الحجر الجالب للمطر" کے عنوان سے لکھتا ہے:

"ابن زکریا الرازی نے کتاب الخواص میں ذکر کیا ہے کہ ترکستان میں خرمن  
 اور چکناک کے درمیان ایک گھائی ہے جسکے پتھروں میں یہ خاصیت ہے کہ اگر فوج یا  
 جانوروں کا ریوڑ وہاں سے غفلت میں گزر جائے اور ان کے قدموں کی تیزی اور شدت  
 سے رگڑ پیدا ہونے لگے تو فوراً بادل چھا جاتا ہے اور شدت سے پانی برسنے لگتا ہے  
 چنانچہ جب کوئی گروہ وہاں سے گزرتا ہے تو اپنے جوتوں پر صوف کے ٹکڑے پڑھتا  
 لیتا ہے تاکہ رگڑ پیدا نہ ہو۔ اس کے بعد الرازی کہتا ہے کہ اس گھائی کے پتھروں کو  
 لوگ اس غرض سے کام میں لاتے ہیں کہ جب چاہیں برسات برسا دیں۔ چنانچہ طریقہ  
 اس کا یہ ہے کہ ایک آدمی یہ پتھر لیکر پانی میں اتر جاتا ہے اور پھر اسے اپنے منہ میں  
 رکھ کر بائیں بلائے لگتا ہے، شوڑی دیر کے بعد اسکی تاثیر اپنا عمل دکھاتی ہے اور برسات  
 برسنے لگتی ہے۔ اس کے بعد لکھتا ہے کہ یہ حکایت صرف الرازی ہی نے نہیں  
 لکھی ہے بلکہ عام طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ عقیدہ اس طرح پھیل گیا ہے کہ گویا  
 اس بارے میں کوئی احتمالات نہیں ہے۔ چنانچہ صاحب کتاب الخواص نے بھی برسات لانے والے  
 پتھر کا ذکر کیا ہے۔" پھر اس کے بعد لکھتا ہے:

"ایک ترک ہیرے پاس یہ پتھر لایا تھا اور اس کا گمان تھا کہ میں اسے

دیکھ کر خوش ہوں گا اور اس کے خاصہ کے بارے میں رد و کد نہیں کروں گا۔ لیکن  
 میں نے اس سے کہا کہ مجھے تجربہ کر کے دکھائے، اگر تجربہ سے اس کا خاصہ ثابت

ہو گیا تو جو کچھ وہ مانگتا ہے اس سے زیادہ اسے صلہ دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ پانی میں اتر کر کھڑا ہو گیا اور پتھر منہ میں رکھ کر دیر تک شور و غل مچاتا رہا لیکن نہ تو بادل چھایا نہ ایک قطرہ پانی برسا۔

فریخ سیاح برزینے بھی جس نے شاہجہاں اور عالمگیر کے زمانے میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی اپنے سفر کشمیر کا حال لکھتے ہوئے ایک ایسے ہی عقیدے کا ذکر کیا ہے جو کشمیریوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے جب ہم پر پنجال کی چوٹی پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک درویش کھڑا ہے اور اشارہ کر رہا ہے کہ خاموش گزر جاؤ، اگر شور و غل ہو تو سخت طوفان آجائے گا۔

اسی طرح کا وہم پرستانہ اعتقاد بعض چشموں کی نسبت بھی لوگوں میں مشہور ہو گیا تھا خیال کیا جاتا تھا کہ اگر ان چشموں میں کسی طرح کی گندگی پھینکی جائے گی تو برسات برسنے لگے گی یا آواز باری شروع ہو جائے گی۔ البیرونی اس وہم پرستی کی حکایتیں نقل کر کے لکھتا ہے:

”کئی بار فوج کے ساتھ میں اسی طرح کے ایک مقام پر سے گزرا۔ فوج میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو نہایت گندے تھے اور ہر طرح کی گندگیاں چٹنے میں ڈالتے تھے تاہم کبھی ایسا نہ ہوا کہ ابر و بادل کا کوئی حادثہ نمودار ہوا ہو۔“  
وصفۃ المتعورہ، صفحہ ۹۰

فلوڈ اور اس کے اقسام پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے:۔  
”فلوڈ کے بارے میں ایک کہانی بیان کی جاتی ہے اور اگرچہ کثرت کے ساتھ تاریخ کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے لیکن خرافات میں داخل ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جب قندھار فتح ہوا تو وہاں فلوڈ کی ایک لاکھ ملی جو ستر ہاتھ لمبی تھی اور جب ہشام بن عمرو نے اس کے نیچے کی زمین کھدوا ڈالی تو معلوم ہوا کہ تیس ہاتھ کے قریب اس کا بچلا حصہ زمین کے اندر تھا پھر جب اس لاکھ کی حقیقت دریافت کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ ملک تیج یمن کی یادگار ہے۔ وہ ایرانیوں کے ساتھ یہاں آئے تھے اور جب ہندوستان پر قابض ہوئے تو انہوں نے اپنی تلواریں کھلا کر یہ لاکھ تیار کرانی پھر اس حقیقت کی بنیاد پڑا اور کہتا ہے یہ بات کیوں کر ہو سکتی ہے کہ ایک بادشاہ اپنی فوج کو اسلحہ سے محروم کر دے اور ان سے ایک یادگار کی لاکھ تیار کرانے؟“

یہ حکایت اگر اصلیت سے خالی نہیں ہے تو یقیناً یہ لاٹ راجہ اشوک کی لاٹوں میں سے ہوگی جو اُس نے اپنے فرامین کنندہ کرنے کے لیے ممالک محروسہ کے مختلف حصوں میں نصب کرائی تھیں۔ ہندوستان میں ایسی چار لاٹیں اب بھی موجود ہیں اور دو خود دہلی میں ہیں البتہ ان کا طول جو سو باٹھ کا بیان کیا گیا ہے، یہ یقیناً مبالغہ ہے۔

دوسروں کی علمی تحقیقات قبول کرنے میں البیرونی نہایت محتاط ہے۔ عام شہرت اور سلمہ ثقاہت اس کے لیے کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اگر خود اس کے مقررہ معیار پر ایک شخص پورا نہیں اترتا تو محض شہرت کی بنا پر وہ اس کی تحقیقات کو پرکاش برابر بھی اہمیت نہیں دیکتا اور ایک عالم محقق کی یہی شان ہونی چاہیے۔ جرجان کے طول بلد کی نسبت اس کے معاصر شیخ ابن سنیانے اپنے رصدی عمل کی جو تفصیلات لکھی تھیں وہ اسے مطمئن نہ کر سکیں، چنانچہ اس بارے میں اس کی رائے گزر چکی ہے، یہاں ہم ایک دوسرے معاملہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ تحدید نہایات الاماکن میں اُس نے بلخ کے طول بلد پر بحث کرتے ہوئے منصور بن طلحہ کا ذکر کیا ہے اور کی فضیلت علمی کا ان لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ ”ھذا الرجل الناظر کا بقیة اللوالة الطاهریة بخراسان و داخط من علوم الرياضیات و ما حولھا یعنی یہ فاضل آدمی خراسان کے والیان طاہری کا بقیہ تھا اور علوم ریاضی اور اس کے متعلقہ فنون میں مہارت رکھتا تھا۔ لیکن پھر آگے چل کر جہاں اس کے رصدی عمل کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے فیصلوں کے ماننے میں متامل نظر آتا ہے کیونکہ اُسے معلوم ہو چکا ہے کہ اس شخص کی اصلی علمی جگہ طبیعیات میں تھی، ریاضیات میں نہ تھی۔ اگرچہ ریاضیات میں بھی مہارت رکھتا تھا اور پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ نجوم کے فن سے بھی اُسے دلچسپی تھی اور جو شخص نجوم کا معتقد ہو اس کا دماغ علوم فلکیہ کے اعمال و احکام میں بے داغ علمی دماغ نہیں ہو سکتا، چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

”و ممکن ان یکون منصور بن طلحہ صحیح ذالک اعتباراً لارصداً بحسب ما ممکنہ لھا جتہ الی تقویم النواکب فقد کان مولعاً بعلم النجوم.... و منصور علی کثرة فضائلہ اثبت قد ما فی الطبیعیات و احکام النجوم من فی الرياضیات و لیس من علم الہنیة بمتکن بحیث یقلد و ان کان ثقة“ (رصدتہ المصورہ ص ۷۷)

صاف یہی ایک مثال اس کے لیے کافی ہے کہ البیرونی کا دماغ اپنے علمی فیصلوں میں کس درجہ محتاط تھا اور کس طرح برصائلے کو بے لاگ علمی اور فائنس عقلی نقطہ نظر سے دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔



## الصیدنہ اور الجماہر

الصیدنہ مفرد ذواؤں کی تحقیقات میں ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اور الجماہر جو اہرات کی تحقیقات میں ہے۔ ان دونوں رسالوں میں البیرونی کا حکیمانہ دماغ ہر جگہ اپنی پوری نمود رکھتا ہے۔ مطالعہ اشیا میں ایک سچے حکیم کی طرح اس کی نگاہ نہایت متجسس اور حقیقت طلب تھی۔ وہ ہر چیز کی جانچ پڑتال کرنی چاہتا تھا اور ہر اظہار اور ہر نمود کو علم و تجربہ کی کسوٹی پر کسنا چاہتا تھا۔ عوام کا کوئی اعتقاد خواص کی کوئی روایت سیاحوں کا کوئی مزعومہ مشاہدہ، مستند کتابوں کا کوئی بیان اس کے لیے دلیل و حجت نہیں ہو سکتی۔ دلیل و حجت صرف علمی تجربہ اور عقلی تصدیق ہے۔

اس زمانے میں جرطی بوٹیوں اور قیمتی پتھروں کی نوعیت اور خواص کے بارے میں طرح طرح کی دور از کار باتیں عام طور پر مشہور ہو گئی تھیں، نہ صرف عوام بلکہ خواص بھی انھیں تسلیم کرتے تھے اور فن کی کتابوں میں انھیں جگہ دیتے تھے لیکن البیرونی ان تمام باتوں کو بلا تامل بے اصل کہہ دیتا ہے اور جا بجا اپنا ذاتی علم و تجربہ پیش کرتا ہے۔ مومیاٹی کے خاصے کی نسبت جو بے اصل روایت مشہور ہو گئی تھی اُس کی بازگشت آج تک ہمارے فن طب میں سنائی دے رہی ہے۔ عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ ٹوٹی ہوئی بڑی جوڑ دینے میں اس کا اثر بے خطا ہے۔ حتیٰ کہ اگر بجزی کی ڈانگ توڑ کر مومیاٹی باندھ دی جائے تو بھٹوڑی دیر کے بعد وہ دوڑنے لگے گی۔ البیرونی کو اس خاصے کے تسلیم کرنے میں تاثر ہے اور وہ اس کے خلاف خود اپنا مشاہدہ بیان کرتا ہے۔ اسی طرح ”فادر ہر“ کے بارے میں بھی اس نے اپنے لیے ہی خیالات ظاہر کیے ہیں۔

معدنیات کی نسبت اس کی تحقیق نہایت قیمتی اور چچی تلی ہے۔ فولاد کی نوعیت اور اس کے اقسام پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے اور نرم آہن کے اقسام واضح کیے ہیں۔ جس سے اعلیٰ درجہ کی تلواریں اور خنجر تیار کیے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ تسلیم کرتا ہے کہ ہندوستان کی سناخی تمام ملکوں سے بازی لے گئی ہے۔

# ہندوستان اور حکیم ابورحمان بیرونی

کتاب الہند، مستشرقین یورپ کی کوششوں سے ابوالرحمان محمد بن احمد بیرونی کی شہرہ آفاق کتاب کتاب الہند، یا "تحقیق مالہند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل" اور ذمہ ۱۸۸۶ء میں شائع ہو چکی ہے۔ بیرونی پانچویں صدی ہجری کا مشہور حکیم اور محقق ہے۔ گیارہویں صدی مسیح کے ادیب یعنی اب سے نو سو برس پہلے اس نے ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔ یہ زمانہ سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کا تھا۔ محمد بن القاسم کی فتح سندھ کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ مسلمان بہ حیثیت جماعت اندرون ہند میں بڑھے۔ مسلمان یہاں کے باشندوں سے ناواقف تھے اور ہندو مسلمانوں سے نا آشنا۔ بیرونی ہندوستان میں بطور سیاح کے داخل ہوا۔ سنسکرت، زبان حاصل کی۔ ہندو علماء کی صحبت میں بیٹھا۔ ہندو علوم کی تحصیل کی۔ ان کے حالات سے واقف ہوا۔ اور پھر غزنی میں بیٹھ کر اپنی یہ جلیل القدر کتاب مرتب کی۔ اس کتاب کے متعلق بالا تفاق تمام محققین حال کا فیصلہ ہے کہ اس عہد کے ہندوستان پر اس سے بہتر اور محققانہ بیان کسی مصنف کا موجود نہیں۔ یہ کتاب ہمارے سامنے نو صدی پہلے کا ہندوستان پیش کرتی ہے۔ اس میں زیادہ تر بکثرت ہندو فلسفہ، الہیات، نجوم، ریاضی وغیرہ علوم سے کی ہے۔ لیکن ضمناً اس وقت کی معاشرتی حالت پر بھی بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں ہم اس کے جسٹہ جہتہ انقلابات پیش کرتے ہیں۔ ان سے قارئین الہلال اندازہ کر سکیں گے کہ قدیم ہندوستان کی معاشرتی ذہنیت کا کیا حال تھا، اور اس طویل مدت میں کتنا کم تغیر اس میں واقع ہوا ہے؟ غالباً کسی ملک کے ذہنی اور معاشرتی جمود و تصلب کی اس سے بہتر مثال دنیا میں موجود نہیں۔

**ہندوستان کے سمجھنے میں دشواریاں** | بیرونی نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں وہ دشواریاں بیان کی ہیں جو غیر قوموں کو ہندوستان کے سمجھنے میں پیش آتی تھیں، وہ لکھتا ہے:

"ہندوستانی ہم سے ان تمام باتوں میں مختلف ہیں جو قوموں میں اشتراک یا آعارف کا ذریعہ ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً:

**۱۔ زبان** | اگرچہ سب قوموں کی زبانیں الگ الگ اور مختلف ہیں لیکن ہندوستان کی زبان (سنسکرت) عربی کی طرح بہت ہی وسیع و دقیق ہے۔ عربی کے یہ اس کی تحصیل عربی سے بدرجہا زیادہ دشوار ہے۔ اس زبان میں ایک ہی چیز کے بہت سے نام اور ایک ہی لفظ کے بہت سے معنی

پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا احاطہ دائرہ اس قدر مشہکل ہے کہ اسماء و مسیماں کی تیز بجز خاص ذہانت و قابلیت رکھنے والوں کے، عام لوگوں کے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ ہندو اپنی زبان کی اس پیچیدگی پر اسی طرح ناز کرتے ہیں جس طرح بعض دوسری قومیں کرتی ہیں، حالانکہ یہ درحقیقت زبان کا عیب ہے۔ نہ کہ خوبی۔

ہندوستان کی زبان کی دو قسمیں ہیں، عامی اور فصیح عامی عوام اور بازاریوں کے استعمال کے لیے ہے۔ فصیح، علم و ادب اور مجالسِ سلاطین و حکماء کے لیے۔ یہ اپنی اشتقاقی، تصریف، نحو کے وقایع، اور بلاغت کی باریکیوں کی وجہ سے اس قدر مغلوق ہے کہ باہر علماء کے سوا اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

پھر یہ زبان ایسے حروف سے مرکب ہے جن میں سے بعض حروف عربی اور فارسی حروف سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہماری زبانیں اور حلق ان کے صحیح تلفظ کی قدرت ہی نہیں رکھتے۔ یہی باعث ہے کہ عربی خط میں ان کی تحریر ناممکن ہے، اگرچہ نقطوں، علامتوں اور عربی سے انہیں اتنا ہی مقید کر دیا جائے۔

پھر بعض حروف سنگین ہیں۔ بعض متروک۔ ساتھ ہی نقل و صحت کا بھی ان کے ہاں زیادہ اہتمام نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کتب، ایک دو نقلوں کے بعد برباد ہو جاتی ہے۔ اور اس کی زبان ایک نئی زبان بن جاتی ہے۔ عوام کی خواہش بھی اسے سمجھ نہیں سکتے۔ خود میرا تجربہ ہے کہ میں نے انہی کے منہ سے کوئی لفظ سنا، پھر مزید تاکید و تفسیح کے خیال سے ان کے سامنے دہرایا تو میں نے دیکھا، خود ان کے لیے اس کا دوبارہ سمجھنا دشوار ہو گیا تھا!

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بعض دوسری عجمی زبانوں کی طرح ان کی زبان میں بھی دو تین ساکن حرف ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں، اور اکثر الفاظ میں ابتدا بہ سکون ہے۔ ہماری زبانیں اس قسم کے الفاظ بولنے کی عادی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے اکثر الفاظ ہم آسانی سے بول نہیں سکتے۔

۳۔ دینی اختلاف | باشندگان ہند ہم سے دین میں بھی کلی اختلاف رکھتے ہیں۔ نہ ان کا کوئی عقیدہ ہمارے لیے قابل تسلیم ہے، نہ ہمارا کوئی عقیدہ ان کے لیے قابل قبول۔ وہ آپس میں بھی مذہبی اختلاف رکھتے ہیں۔ مگر یہ اختلاف فروعی ہیں دوسری قوموں سے ان کا اختلاف اصولی ہے۔ وہ سب قوموں کو ملیج (لمپچہ) یعنی ناپاک کے لقب سے پکارتے ہیں اور ان سے ملنا جلنا

ناجائز سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُس پانی اور آگ کو بھی ناپاک سمجھتے ہیں جو کسی غیر باشندہ ہند کے استعمال میں آئی ہو۔

پھر ان کے خیال میں یہ نجاست اس درجہ شدید ہے کہ پاکی کی کوئی صورت بھی ممکن نہیں۔ یہ کسی حال میں بھی جائز نہیں کہ غیر ہندو اگر یہ ہندو مذہب کا کتا ہی قایل ہو جائے، ان میں داخل ہو سکے، یا جو آدمی ان کے دین سے ایک مرتبہ نکل گیا ہے، وہ پھر اُس میں لوٹ سکے۔ اس صورت حال کا تخریق نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام دنیا سے بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ کوئی ہندو من بھی نہیں اور انہیں جوڑنے والا موجود نہیں۔

**۳۔ رسوم و عادات** | یہ مغایرت اس درجہ شدید ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ہم سے ہمارے لباس سے ہمارے وضع و خصلت سے ڈرایا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمیں شیطنیت کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ہم سے نفرت ان کے دلوں میں اس قدر راسخ ہے کہ خود میں نے اپنے کانوں سے انہیں کہتے سنا دیا تھا۔ سرزمین کے ایک بادشاہ نے اگر ہمارا ایک بادشاہ مار ڈالا تھا۔ مہلوں اپنے پیچھے ایک شیر ذرا پیچھے پھوٹ گیا۔ جب بچہ جوان ہوا اور اپنی ماں سے اپنے باپ کا حال سنا تو سخت غضب ناک ہوا۔ ہمارے ملک پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے بے حساب مخلوق قتل کی۔ جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے مفلوبوں کو اس وضع کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جو آج کل تمہاری وضع ہے۔ ہراوی کا اس قصہ بے مقصود یہ تھا کہ ہماری وضع ذات کی وضع ہے، اور انہی کے ایک بادشاہ نے ہمیں اس کے اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے! میں نے یہ افسانہ سُن کر ان کے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا کہ معاملہ اتنے ہی پر ختم ہو گیا اور اس نتائج نے ہمیں ہندو بننے اور ہندو رسم و رواج اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا!

**۴۔ مسلمانوں کا حملہ** | مسافرت کی بڑی وجہ ہندوستان پر مسلمانوں کا حملہ ہے۔ میں الدولہ سلطان محمود غزنوی کی جنگوں نے انہیں بہت ہی سخت نقصان پہنچایا۔ ان کی آبادیاں برباد ہو گئیں۔ انہیں منتشر و پراگندہ کر دیا گیا۔ ان کی صرف سلطنت ہی منہیں گئی، بلکہ مفتوحہ علاقوں سے ان کے علوم و فنون بھی مٹ گئے، اور ایسے دور دراز خطوں میں جلا وطن ہو گئے، جہاں تک رسائی مشکل ہے۔ مثلاً کشمیر اور بانارس (بنارس) وغیرہ (بنارس) کو دور اس لیے کہا ہے کہ یہ پنجاب اور وسط ہند سے دور مشرق کی طرف ہٹا ہوا ہے)

یہی دینی اور سیاسی اسباب ہیں جن کی بنا پر ہندوؤں میں مسلمانوں اور تمام اجنبیوں سے سخت نفرت و عداوت پیدا ہو گئی ہے۔

۵۔ تنگ نظری | پھر اُن کے اخلاق میں ایک اور بات بھی راسخ ہو گئی ہے۔ اور کسی طرح نکل نہیں سکتی۔ یہ اُن کے انتہائی علمی و ذہنی تنزل کا نتیجہ ہے۔ وہ یقین کرتے ہیں کہ دنیا صرف انہی کی دنیا ہے۔ انسان صرف انہی کی سر زمین پر موجود ہیں۔ بادشاہ صرف انہی کے بادشاہ ہیں۔ دین صرف انہی کا دین ہے اور علم صرف انہی کا علم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہایت مغرور اور بر خود غلط ہو گئے ہیں۔ اگر ان سے علماء عرب و عجم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تو مخاطب کو جاہل خیال کرنے اور اُس کی تصدیق پر ہرگز آمادہ نہیں ہوتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ سیر و سیاحت کے عادی ہوتے اور اپنے پہاڑی حدود سے نکل کر غیر قوموں سے ملتے، تو یہ جاہلانہ و طفلانہ خیال ان میں پیدا نہ ہوتا۔

لیکن یاد رہے کہ اُن کے پیش روؤں کا یہ حال نہ تھا۔ ان کا مشہور فاضل بڑا بہرہ برہمنوں کی تعظیم کے بیان میں کہتا ہے، ”جب یونانیوں نے باوجود ناپاک ہونے کے علوم و فنون میں کمال حاصل کیا اور سب پر بازی لے گئے، تو اُن کی بھی تعظیم واجب ہو گئی۔ ان کا درجہ بھی برہمن کا درجہ ہو گیا؛ خود میری حالت یہ ہوئی کہ مدت تک ان کے منجوں کے سامنے زانوئے شاگردی تمہ کرتا رہا۔ کیونکہ میں اُن کی زبان اور اُن کے طریقوں سے بے خبر تھا۔ لیکن جب کچھ اُن کی زبان میں دخیل پیدا ہو گیا تو میں انہیں اپنے یہاں کے علما کی بنا پر ایشیا کی غلتوں اور حساب و ریاضی کے براہین سمجھانے لگا۔ اس پر وہ سخت متعجب ہوئے اور استفادہ میں باہم پیش قدمی کرنے لگے۔ بڑی حیرت سے پوچھتے تھے: ”ہندوستان کے کن کن علماء کو تم نے دیکھا ہے؟ کن کن سے فائدہ اٹھایا ہے؟“ کیونکہ اُن کے خیال میں علم ہندوستان کے سوا کہیں ہے ہی نہیں۔ جب میں نے اُن سے کہا کہ میں پہلی مرتبہ اُن سے ملا ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں، یہ دنیا کے دوسرے تھکوں کے علوم ہیں، تو وہ اور زیادہ متعجب ہوئے، اور بعض نے تو مجھے جادوگر سمجھنا شروع کر دیا۔“

# کتابِ ہند

ہندوستان کے فنون لطیفہ اور عرب | یہ عجیب بات ہے کہ عربوں نے ہندوستان کے تمام علوم و فنون میں دلچسپی لی، لیکن ہندوستان کی موسیقی پر ایک غلط انداز نظر بھی نہ ڈال سکے۔ ابوریحان البیرونی نے کتابِ ہندی میں ہندوؤں کے تمام علوم و عقاید پر نظر ڈالی ہے اور ایک باب میں کہتہ ہیں کہ سائنس و علوم پر بھی لکھا ہے، مگر موسیقی کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ ڈاکٹر اڈورٹسٹاؤٹ نے لائبریری کے مقدمے میں البیرونی کا ایک مکتوب درج کیا ہے، جس میں اس نے اپنی تمام مصنفات کا تفصیل ذکر کیا تھا مگر اس میں بھی اس موضوع پر کوئی تصنیف نظر نہیں آتی حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے نالک سلطان محمود اور سلطان مسعود کے درباروں میں اپنے کمالات فن کی نمائشیں کرنے لگے تھے اور ہندوستان کے ذمہ دار اور باجے غزنین کے گلی اور کوچوں میں بجائے جا رہے تھے۔ غالباً اس تغافل کی وجہ سے تو یہ ہو گیا کہ علوم عقیدہ کے شوق و اشتغال نے اس کی بہت کم مہلت دی کہ فنون لطیفہ کی طرف توجہ کرنے اور کچھ یہ بات بھی ہو گی کہ عربوں کا ذوق سماع ہندوستان کے ذوق سماع سے اس درجے محتاط تھا کہ ایک کے کان دوسرے کی نواؤں سے مشکل آشنا ہو سکتے تھے۔

ہندوستان کی موسیقی کی طرح ہندوستان کے ڈراموں سے بھی عرب مصنف یک قلم نا آشنا ہے۔ ابیرونی نے سنسکرت کی شاعری اور فنِ عروض کا تفصیل ذکر کیا ہے، لیکن ناٹک کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ یونانی ادبیات کی طرح سنسکرت ادبیات کی بھی ایک خاص اور ممتاز چیز ناٹک ہے۔

ناٹک کے ذریعے شکار کا طریقہ | ہندوستان کے قدامتے فن نے موسیقی اور رقص کی ایک خاص قسم ایسی قرار دی ہے۔ جس کی نسبت ان کا خیال تھا کہ صحرائی جانوروں کو بے خود کر کے رام کرنے میں خصوصیت کے ساتھ مؤثر ہے۔ ابر کے زمانے میں رقص اور گانے کی یہ قسم شکار قمرغہ کے سرو سامان میں داخل ہوتی اور اس کے طائفے باکمالان فن کی نگرانی میں تیار کرائے گئے۔ امرام مخلص نے نہرآہ المصلیات میں اس طریق شکار کی بعض دلچسپ تفصیلات لکھی ہیں۔ وہ لکھتا ہے جب شکار قمرغہ کا اہتمام کیا جاتا تھا تو یہ طائفے شکار گاہ میں بھیج دیے جاتے اور رقص و سرود شروع کر دیتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد آہستہ آہستہ چاروں طرف سے ہرن سر نکالنے لگتے اور پھر رقص و سرود کی محوت انہیں بالکل طائفے کے قریب پہنچا دیتی۔ جہاں گرنے ایک مرتبہ شکار قمرغہ کا اہتمام کیا اور اسی رقص و سرود کا جال پھرایا جب ہرنوں کے غول ہر طرف سے نکل کر سامنے آکھڑے ہوتے تو نو۔ جہاں کی پان

پرے اختیار اور خیر و کلمہ شعر طاری ہو گیا ہے

ہمہ آبروانِ محروم ہو گیا وہ ہمارا وہ برکت ہے

بہا بدیاں کہہ دوں سے شکار خواہی آگے

یہ شہ سن کر سہانگی کی غیرت بردی نے گوارا نہ کیا کہ شکار نے لیے ہاتھ اٹھائے، دل گرفتہ واپس آ گیا۔  
یہ خیال کہ جانور گائے سے متاثر ہوتے ہیں دنیا کی تمام قوموں کی قدیمی روایتوں میں پایا جا رہا ہے۔  
کوات میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی نغمہ سرنی پر گدوں کو بے خود کر دیا تھا یہی پروانی روایا سننے میں بھی ایک سے زیادہ اشخاص کی نسبت اس ہی مشیہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے قدیمہ شخص نے تو اسے ایک مسلمہ حقیقت مان کر اپنے بے شمار عملیات کی بنیادیں اسی عقیدے پر استوار کی تھیں۔  
سانپ اگھوڑے اور اونٹ کا تاثر عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے حدیث کی لئے اگر رک جاتی ہے تو رک کی تیز رفتاری بھی رک جاتی ہے۔

حدیث تیز تری خواں چوں نمل را گراں بینی

ایرونی نے کتاب الہند میں راگ کے ذریعے شکار کرنے کے طریقوں کا ذکر کیا ہے وہ خود اپنا مشاہدہ نقل کرتا ہے کہ شکاری نے ہرن کو ہاتھ سے پکڑ لیا تھا اور ہرن میں بھاگنے کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ہندوؤں کا یہ قول بھی نقل کرتا ہے کہ اگر ایک شخص اس کام میں پوری طرح ماہر ہو تو اسے ہاتھ بڑھا کر پکڑنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئے وہ صید کو جس طرف لے جانا چاہے صرف اپنے راگ کے زور سے لگاتے لے جائے۔ پھر لکھتا ہے، جانوروں کی اس محبوبیت و تکرار کو عوام تعویذ اور گنڈے کا اثر سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ محض کمانے کی تاثیر ہے۔ پھر ایک دوسرے مقام میں جہاں جہزیہ سرائیپ کا ذکر کیا ہے، لکھتا ہے یہاں بندر بہت ہیں۔ ہندوؤں میں مشہور ہے کہ اگر کوئی مسافر ان کے ٹول میں پھنس جائے اور المیہ کے وہ اشعار جہنمان کی مدح میں لکھے گئے ہیں پڑھنے لگے تو بتدریج اس کے مصلحت ہو جائیں گے اور اسے کچھ نقصان نہیں پہنچے گا پھر کرتا ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کی تہ میں بھی وہی گانے کی تاثیر کام کرتی ہوگی۔ یعنی رایین کے اشعار کے مطالب کا یہ اثر نہ ہوگا۔ اشعار کی لئے اور مسرائی کی تاثیر ہوگی۔ پہلی تصریح غالباً اس باب میں ہے جو فی ذکر علوم الہم کاسرۃ الاحیاء علی انوار الجہلی کے عنوان سے ہے۔ اور دوسری تصریح اس کے بعد کے باب میں ملے گی جو فی تہارت شتی من بلادہم و انہارہم کے عنوان سے لکھا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ زانہماں کا علم الجیوان اس خیال کی واقعیت تسلیم نہیں کرتا اور زانہماں کے مشاہدات کو دوسری علتوں پر محمول کرتا ہے۔ سانپ کے بارے میں لکھا جاتا ہے کہ اس میں سرے سے سماء کا تاثر نہیں ہے۔

مقبس از اخبار خاطر

## اصطلاحات

### جن کے اردو یا انگریزی متبادل مولینا نے استعمال کیے

ALTITUDE	ارتفاع
ASTRONOMICAL	فلکی، ہیئت سے متعلق
ASTRONOMICAL OBSERVATION	ریصدی تحقیقات، ارض و فلکی
ASTRONOMY	علم الافلاک، فلکیات، علم ہیئت
ASTROLOGY	علم نجوم، جوتش
AXIS ( OF EARTH ) EARTH AXIS	محور زمین کا، محور ارضی
CARTOGRAPHY	علم رسم الارض، نقشہ نگاری
CLIMATE, COUNTRY	اقسیم
DECLINATION	میل
DEGREE	درجہ
DEGREE OF LATITUDE	درجہ عرض البلد
DEGREE OF LONGITUDE	درجہ طول البلد
EARTH AXIS	محور زمین کا، محور ارضی
EQUATOR	خط استوا
GEOGRAPHY	جغرافیہ، فن جغرافیہ
GEOMETRY	علم ہندسہ
GLOBE SPHERE	کرہ ارضی



GLOBULAR	کروی، کرے کی شکل کا
GRATICULE	تخطیط
HEMISPHERE	نصف کرہ
HEAVENLY BODIES	اجرام سماوی
LAND SURVEYING	مساحت
LATITUDE	عرض البلد
LINE OF A LATITUDE	خط عرض البلد
LONGITUDE	طول البلد
MAGNITUDE	معدود
MENSURATION	مساحت
MERIDIAN CIRCLE	دائرہ نصف النہار
METAPHYSICS SCHOOL	فلسفہ ما بعد الطبیعات، مدرسہ الہیات، مدرسہ الطبیعیات، مکتبہ فکر
MINUTE	دقیقہ
OBSERVATORY	رصد گاہ
OBSERVATION	رصد، مشاہدہ
ORTHOGRAPHIC PROJECTION	تسطیح کرہ
PRACTICAL ASTRONOMY	دفعہ، مشاعرہ، العینیۃ التجربہ
SCHOOL	مدرسہ
SECOND	ثانیہ
SEVEN CLIMATE, SEVEN REGION (Whole World)	اتالیم السبعہ، ہفت اقلیم، ہفت کشور
SEXTANT	الفوری
SOLAR ECLIPSE	سولہ گرہن

SPHERIC STRONOMY

رقن، البقیۃ الکروی

STADIA

قدیم یونانی اسٹراڈیا آج کل کے چرسونٹ نوائیج کے برابر ہوتا ہے

STANDARD LINE

خط معیار

STEREOGRAPHY

سطح مستوی پر کٹھنوں تصویر بنانے کا فن

TABLE

جدول، تریخ

TANGENTS

جنوب و امیال



